صفر المظفر ۱۴۳۶ھ
دسمبر ۲۰۱۴ء

ماہنامہ

میثاق (لاہور)

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

فرائض کا التزام — اور
رسول اللہ ﷺ کی جامع نصیحتیں
(مطالعۂ حدیث)
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

داعی رجوع الی القرآن، بانی تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القُرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سورۃ الفاتحہ و سورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
(نواں ایڈیشن) — صفحات:360، قیمت 475 روپے

حصہ دوم سورۃ آلِ عمران تا سورۃ المائدہ
(چھٹا ایڈیشن) — صفحات 321، قیمت 425 روپے

حصہ سوم سورۃ الانعام تا سورۃ التوبہ
(پانچواں ایڈیشن) — صفحات 331، قیمت 425 روپے

حصہ چہارم سورۃ یونس تا سورۃ الکہف
(چوتھا ایڈیشن) — صفحات 394، قیمت 475 روپے

حصہ پنجم سورۃ مریم تا سورۃ السجدۃ
(تیسرا ایڈیشن) — صفحات 480، قیمت 575 روپے

حصہ ششم سورۃ الاحزاب تا سورۃ الحجرات
(پہلا ایڈیشن) — صفحات 484، قیمت 590 روپے

ملنے کے پتے

انجمن خدام القرآن خیبر پختونخوا پشاور
A-18 ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر2، شعبہ بازار پشاور، فون: 2214495، (091)2584824

مکتبہ خدام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمِيۡثَاقَهُ الَّذِىۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد :	63
شمارہ :	12
صفرالمظفّر	1436ھ
دسمبر	2014ء
فی شمارہ	25/-

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

اندرون ملک	250 روپے
بھارت وبنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا' یورپ' افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700 ' فون: 3-35869501
فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org
ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ' گڑھی شاہو' لاہور
فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36313131

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5
افغانستان: قانونِ فطرت کو سمجھئے! — محبوب الحق عاجز

بیانُ القُرآن — 9
سورۃ الکہف (آیات ۸۳ تا ۱۱۰) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تفہیم القُرآن — 29
فتنۂ انکارِ حدیث — سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مطالعۂ حدیث — 33
فرائض کا التزام اور رسول اللہ ﷺ کی جامع نصیحتیں — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

منتخب نصاب ۲ — 57
جماعتی زندگی کا مہلک ترین مرض: نجویٰ — انجینئر حافظ نوید احمد

تعمیرِ سیرت — 75
تکبّر: ایک تجزیاتی مطالعہ — ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

دعوتِ فکر — 83
کم سنی کی شادی — اجود صدیقی

افکار و آراء — 89
تیسری عید؟ — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

بحث و نظر — 94
ذوالقرنین' سدِ ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج (۴) — شاہین عطر جنجوعہ

❀ ❀ ❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

افغانستان: قانونِ فطرت کو سمجھئے!

نائن الیون کے واقعہ کے بعد کرۂ ارض کی واحد عالمی طاقت امریکا اپنے نیٹو اتحادیوں کا لشکر لے کر افغانستان پر چڑھ دوڑی۔ امارتِ اسلامی افغانستان کے خاتمہ کے لیے چھیڑی گئی اِس جنگ میں عالمِ کفر ہی نہیں عالمِ اسلام کے بھی ''فرماں بردار'' حکمرانوں نے اُس کا ساتھ دیا' اور لشکر کفار کا حصہ بن کر اسلامی حکومت کے خلاف امریکا کی ہر طرح سے مدد کی۔ مملکت خداداد پاکستان ایک نظریے کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آئی۔ یہ نظریہ اسلامی نظریہ تھا۔ مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ ہم نے بھی اپنے اساسی نظریے کو فراموش کر کے امریکی کیمپ میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا اور طالبان مخالف اتحاد میں شامل ہو گئے۔ ۲۰۰۱ء میں شروع کردہ جنگ کو اب تیرہ سال ہو گئے ہیں۔ اِس عرصہ میں افغانستان کی سنگلاخ چٹانوں' جری ہمت افغانوں اور سرفروش مجاہدین سے ٹکرا کر عالمی طاقت کا نشۂ قوت اُتر چکا ہے' مگر وہ جو کہتے ہیں کہ رسّی جل گئی پر بل نہ گیا' امریکا شرمناک شکست سے دوچار ہو کر بھی ہار ماننے کو تیار نہیں۔ وہ اب بھی حیلے بہانوں اور سازشوں سے اسلامی حکومت کا راستہ روکنا چاہتا ہے۔ اپنی تاریخ کی عبرتناک شکست کے بعد اُس کا تمام تر انحصار اب اُس سیاسی انتظام پر ہے جس نے دس سال کے لیے اُسے افغانستان میں اپنی سپاہ ٹھہرانے کی اجازت دی ہے اور طالبان حریت پسندوں کو اُبھرنے نہ دینے کا یقین دلایا ہے۔

افغانستان سے امریکا اور اتحادیوں کی رخصتی کے بعد افغانستان ایک مرتبہ پھر اُسی صورتحال سے دوچار ہو گا جو اُسے سوویت یونین کی شکست اور انخلاء کے بعد درپیش تھی۔ یہ ایک نازک صورتحال ہے' جس میں افغان طالبان اور حکومت پاکستان دونوں کو نہایت محتاط رویّہ اختیار کرنے اور دانشمندانہ حکمت عملی وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ اِس موقع پر عجلت یا وقتی مصلحت کے تحت کیے گئے فیصلے منفی نتائج پیدا کر سکتے ہیں۔ توقع یہ تھی کہ امریکا اور اتحادی ماہ دسمبر میں افغانستان سے نکل جائیں گے' لیکن تازہ ترین اطلاعات کے مطابق امریکہ نے اپنی

فوج کو مزید دو سال افغانستان میں ٹھہرانے کا فیصلہ کیا ہے۔ بہرحال نئی صورتحال میں افغانستان کے امریکا نواز نومنتخب صدر اشرف غنی کا سارا زور اِس بات پر ہے کہ جیسے بھی ہو' اپنے اقتدار کا تحفظ یقینی بنایا جائے۔ اس لیے کہ افغان امریکا جنگ کے فاتح طالبان امریکا کی رخصتی کے بعد کٹھ پتلی انتظامیہ سے فیصلہ کن معرکہ کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ افغان صدر یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ طالبان مجاہدین جو عساکر عالم کے مقابلے میں سینہ تان کر کھڑے رہے' اور سرفروشی اور عزیمت کی شاندار مثالیں قائم کر کے اپنے ملک کے دفاع اور اسلامی نظام کے احیاء کے لیے کوشاں رہے' ان کا مقابلہ کسی طور بھی افغان فوج کے لیے ممکن نہیں' جو امریکا نے اپنی ضروریات اور مفادات کے تحت کثیر سرمایہ خرچ کر کے کھڑی کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے حالیہ دورۂ پاکستان میں حکومت پاکستان سے دفاعی تعاون مانگا ہے۔

علاوہ ازیں امریکی انتظامیہ نے پاکستان کے آرمی چیف جنرل راحیل شریف کو یہ ٹاسک بھی دیا ہے کہ پاکستان افغان طالبان کو اقتدار میں شریک کر کے افغانستان کے موجودہ سیاسی سیٹ اَپ کا حصہ بنائے۔ فی الحال یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ پاکستان نے یہ ذمہ داری قبول کی ہے یا نہیں' البتہ افغان طالبان خصوصاً امیر المؤمنین ملا عمر کے طرزِ عمل کو اور طرزِ سیاست کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یقین سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کسی صورت اس دوئی کو قبول نہیں کریں گے۔ لہٰذا حکومت پاکستان کو ایسی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکا کی تیار کردہ افغان فوج کی صلاحیتوں اور استعداد پر خود امریکا بارہا عدم اعتماد کر چکا ہے۔ امریکی فوج کے افغان فوج اور دیگر فورسز کو تربیت فراہم کرنے والے انسٹرکٹر جنہیں ''گرین بیریٹس'' کہا جاتا ہے اپنی ایک خفیہ رپورٹ میں یہ کہہ چکے ہیں کہ افغان فوج میں شامل اہلکاروں کی اکثریت بزدل ہے اور وہ افغان طالبان کا مقابلہ کرنے کی بجائے فرار کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ افغان اہلکاروں کی پست ہمتی اور بزدلی کے کئی واقعات کا تذکرہ کرنے کے بعد ان انسٹرکٹرز نے لکھا ہے کہ ۲۰۱۴ء میں افغانستان سے امریکی انخلاء کے بعد کا منظر نامہ بہت بھیانک ہو سکتا ہے۔ کیونکہ طالبان انتہائی طاقتور اور بے خوف ہیں اور دارالحکومت کابل پر یلغار کرنے کے لیے اتحادی افواج کے غالب حصے کے انخلاء کا انتظار کر رہے ہیں۔ جبکہ اربوں ڈالر خرچ کرنے والی چار لاکھ افغان فوج کے اہلکار بزدل اور کم ہمت ہیں اور کسی طور افغانستان کا (طالبان سے) دفاع کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

افغان صدر کے دفاعی تعاون طلب کرنے پر ہماری حکومت اور افواج نے انہیں اپنے تعاون کا یقین دلایا ہے اور انہیں افغان فوج کی تربیت کی پیشکش کی ہے۔ یہ اطلاعات بھی ہیں کہ پاکستان نے افغان فوج کو کابل کے دفاع کے لیے ٹرپل ون بریگیڈ کی طرز پر تربیت دینی بھی شروع کر دی ہے۔ افغان صدر کا دفاعی تعاون مانگنا اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے ہے۔ جبکہ افغانستان سے امریکی انخلاء کے بعد وہاں ہماری دلچسپی دو پہلوؤں سے ہے۔ ایک یہ کہ افغانستان میں غیر ملکی ایجنسیوں کا عمل دخل ختم کیا جائے جو ایک عرصے سے افغانستان کے راستے پاکستان میں عدم استحکام اور انتشار کے شعلے بھڑکا رہی ہیں۔ دوسرا عنصر افغانستان میں ہمارے ازلی دشمن بھارت کے اثر و رسوخ کا خاتمہ (یا کم از کم اُس میں کمی) کرنا ہے۔ اشرف غنی کے الیکشن جیتنے کے بعد آرمی چیف راحیل شریف نے کابل جا کر افغان صدر سے کمانڈر انچیف جنرل بسم اللہ اور آرمی چیف جنرل شیر محمد کریمی کی موجودگی میں ملاقات کی اور انہیں مذکورہ بالا تحفظات سے آگاہ کیا۔ باخبر ذرائع کا کہنا ہے کہ افغان صدر نے نہ صرف اُس موقع پر بلکہ اپنے حالیہ دورۂ اسلام آباد میں بھی ان دونوں معاملات پر حکومت پاکستان کو اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا ہے۔ بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ ہماری حکومت اور افواج نے افغان صدر کو دفاعی تعاون اور افغان فوج کو تربیت دینے کی پیشکش اِسی صورتحال کے تناظر میں کی ہے۔

اس امر سے کون انکار کر سکتا ہے کہ افغانستان میں اپنے مفادات کا تحفظ ناگزیر ہے اور عالمی طاقت امریکا کی رخصتی کے بعد وہاں انڈیا کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا خاتمہ، اسلام اور پاکستان دشمن خفیہ ایجنسیوں کی سازشوں کے توڑ اور سرزمین افغانستان سے ہمارے قبائلی علاقوں اور بلوچستان میں دراندازی روکنے کے لیے منصوبہ بندی کی ازبس ضرورت ہے۔ یہ ریاست کے دفاع کا تقاضا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہم افغان فوجیوں کو تربیت دیں گے تو اس سے افغانستان میں بھارتی اثر و رسوخ کم ہو گا، مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا یہ فیصلہ نتائج کے اعتبار سے سود مند ہو گا؟ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے، جس کا جواب سوچ لینا چاہیے۔ اِس لیے کہ اس کا واضح طور پر مطلب یہ ہو گا کہ ہم افغان جنگ کے فاتح طالبان کے مخالفین کی مدد کر رہے ہیں۔ ہم یہ بات کیوں فراموش کر رہے ہیں کہ قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک صرف ملا عمر کا دور ہی پاکستان افغانستان تعلقات کے حوالہ سے بہترین دور تھا، لہٰذا اب بھی افغانستان میں پاکستان کے مفادات کا بہترین تحفظ افغان طالبان کی حکومت ہی میں ممکن

ہے۔ افغانستان کا مستقبل جنگ کے میدانوں میں سرخرو ہونے والے طالبان سے وابستہ ہے۔ اب اگر حکومت سازی کے فیصلہ کن مرحلے پر بھی ہم نے ان سے عیاری کی اور انہیں تنہا چھوڑ دیا تو یہ امر ہمارے مستقبل کے لیے خطرناک ہو گا۔ ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ طالبان نے ایک نظریے کے تحفظ کے لیے جنگ لڑی ہے، وہ نظریہ جسے عالمِ کفر دنیا میں کہیں بھی سر نہ اٹھانے دینے کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔ طالبان کفر کے عالمی جتھے کو شکست دینے کے بعد اُس نظریے کے غالب ہونے تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ امریکا اور اتحادیوں نے ۲۰۰۱ء میں اسلامی نظریے اور اسلامی حکومت ہی کے خاتمہ کے لیے نام نہاد دہشت گردی کے عنوان کے تحت افغانستان کو بدامنی اور انتشار کی آگ میں جھونکا۔ تب سے اب تک انہوں پوری کوشش کی کہ طالبان کی مزاحمت ختم کر دی جائے، تاکہ اُن کے دوبارہ اُبھرنے کا کوئی امکان باقی نہ رہے، مگر انہیں اس کوشش میں منہ کی کھانی پڑی۔ اب عالمی طاقتیں یہ چاہتی ہیں کہ پاکستان اُن کے اِس نامکمل مشن کو پورا کرے، جسے وہ تیرہ سال سے پورا کرنے میں ناکام رہیں۔

ہم نے ایک نہایت غلط فیصلہ نائن الیون کے بعد اسلامی امارت افغانستان کے خلاف امریکا کا ساتھ دے کر کیا تھا۔ یہ فیصلہ دین و شریعت کے خلاف تھا ہی، اخلاقیات کے مسلّمہ اصولوں کے بھی یکسر منافی تھا۔ اُس فیصلہ کی سزا ہم آج تک داخلی انتشار کی صورت میں بھگت رہے ہیں۔ اب افغانستان کی امریکا نواز انتظامیہ کو سنبھالا دے کر اور وہاں کے اصل اور حقیقی حکمرانوں —— طالبان —— کا راستہ روک کر ایک مرتبہ پھر ہم اُس غلطی کا اعادہ کر رہے ہیں، جو کسی طور پر بھی ہمارے لیے سود مند نہ ہو گا۔ ریاستوں کے ساتھ معاملات طے کرتے وقت محض وقتی مصلحتوں اور بڑی طاقتوں کی خوشنودی کو پیش نظر رکھنا دانشمندی نہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تاریخی، جغرافیائی اور سب سے بڑھ کر نظریاتی عنصر کو ملحوظ رکھا جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان اور افغانستان کی سلامتی کے تقاضے ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ ان کو الگ الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ افغانستان دراصل ایشیا کا دل اور مرکز ہے۔ یہ ماضی میں خطے میں ہونے والی تبدیلیوں کا مرکز رہا ہے۔ عالمی طاقتوں کے مفادات اور خوشنودی سے قطع نظر، پاکستان اور خود افغانستان کے نقطہ نظر سے افغانستان میں ایسی حکومت کے قیام کی راہ ہموار کرنا ضروری ہے، جو افغان عوام کی صحیح معنی میں نمائندگی کرے اور پاکستان کی بھی خیر خواہ ہو۔ اِس معیار پر صرف طالبانِ افغانستان پورا اترتے ہیں کہ انہوں نے اپنے

(باقی صفحہ 28 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الکھف

آیات ۸۳ تا ۱۰۱

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝۸۳ۭ اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ
فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۝۸۴ۙ فَاَتْبَعَ سَبَبًا ۝۸۵ حَتّٰٓي اِذَا بَلَغَ
مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ڛ قُلْنَا
يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ۝۸۶ قَالَ اَمَّا مَنْ
ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝۸۷ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ
وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَاۗءَۨ الْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۝۸۸ۭ ثُمَّ اَتْبَعَ
سَبَبًا ۝۸۹ حَتّٰٓي اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰي قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ
مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝۹۰ۙ كَذٰلِكَ ۭ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۝۹۱ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝۹۲
حَتّٰٓي اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ
قَوْلًا ۝۹۳ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ
نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓي اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝۹۴ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ
خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۝۹۵ۙ اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ۭ
حَتّٰٓي اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ
اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ۝۹۶ۭ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ
نَقْبًا ۝۹۷ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّاۗءَ ۚ وَكَانَ
وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ۝۹۸ۭ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ

فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ۝۹۹ۙ وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَىِٕذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَا ۝۱۰۰ۙ الَّذِيْنَ كَانَتْ
اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَاۗءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ۝۱۰۱ۧ

اس رکوع میں ذوالقرنین کے بارے میں یہودِ مدینہ کے سوال کا جواب دیا گیا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز تک اکثر مفسّرین ذوالقرنین سے ناواقف تھے۔ چنانچہ تیرہ سو سال تک عام طور پر سکندر اعظم ہی کو ذوالقرنین سمجھا جاتا رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن میں ذوالقرنین کی فتوحات کا ذکر جس انداز میں ہوا ہے یہ انداز سکندر اعظم کی فتوحات سے ملتا جلتا ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذوالقرنین کی سیرت کا وہ نقشہ جو قرآن نے پیش کیا ہے اس کی سکندر اعظم کی سیرت کے ساتھ سرے سے کوئی مناسبت ہی نہیں۔

بہرحال جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ذوالقرنین قدیم ایران کے بادشاہ کیخورس یا سائرس کا لقب تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ایران کے علاقے میں دو الگ الگ خود مختار مملکتیں قائم تھیں۔ ایک کا نام پارس تھا جس سے ''فارس'' کا لفظ بنا ہے اور دوسرے کا نام ''مادا'' تھا۔ کیخورس یا سائرس نے ان دونوں مملکتوں کو ملا کر ایک ملک بنا دیا اور یوں سلطنت ایران کے سنہرے دور کا آغاز ہوا۔ دو مملکتوں کے فرمانروا ہونے کی علامت کے طور پر اس نے اپنے تاج میں دو سینگ لگا رکھے تھے اور اس طرح اس کا لقب ذوالقرنین (دو سینگوں والا) پڑ گیا۔

آیت ۸۳ ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝۸۳﴾

''اور یہ لوگ آپؐ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپؐ کہیے کہ ابھی میں آپ لوگوں کو اس کا حال بتاتا ہوں۔''

ذوالقرنین کے بارے میں جدید تحقیق کو اہل علم کے حلقے میں متعارف کرانے کا سہرا مولانا ابوالکلام آزادؒ کے سر ہے۔ انہوں نے اپنی تفسیر ''ترجمان القرآن'' میں اس موضوع پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ قدیم ایران کا بادشاہ کیخورس یا سائرس ہی ذوالقرنین تھا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تحقیق کی بنیاد ان معلومات پر ہے جو شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی کے دور میں ایک کھدائی کے دوران دستیاب ہوئی تھیں۔ اس کھدائی کے دوران اس عظیم فاتح بادشاہ کا ایک مجسمہ بھی دریافت ہوا تھا اور مقبرہ بھی۔ اس کھدائی سے ملنے والی معلومات کی بنیاد پر رضا شاہ پہلوی نے اُس کی ڈھائی ہزار سالہ برسی منانے کا خصوصی اہتمام کیا تھا۔ دریافت شدہ مجسمے کے سر پر جو تاج تھا اس میں دو سینگ بھی موجود تھے جس سے یہ ثابت ہو گیا

کہ ایران کا یہی بادشاہ (کیخورس یا سائرس) تھا جو تاریخ میں ذوالقرنین کے لقب سے مشہور ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہودیوں نے خصوصی طور پر یہ سوال کیوں پوچھا تھا اور ذوالقرنین کی شخصیت میں ان کی اس دلچسپی کا سبب کیا تھا؟ اس سوال کا جواب ہمیں بنی اسرائیل کی تاریخ سے ملتا ہے۔ جب ۵۸۷ قبل مسیح کے لگ بھگ عراق کے بادشاہ بخت نصر نے فلسطین پر حملہ کر کے یروشلم کو تباہ کیا تو اس شہر کی اکثریت کو تہ تیغ کر دیا گیا اور زندہ بچ جانے والوں کو وہ اپنی فوج کے ساتھ بابل (Babilonia) لے گیا' جہاں یہ لوگ ڈیڑھ سو سال تک اسیری کی حالت میں رہے۔

جب ایران کے بادشاہ کیخورس یا سائرس (آئندہ سطور میں انہیں ''ذوالقرنین'' ہی لکھا جائے گا) نے ایران کو متحد کرنے کے بعد اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کیا تو سب سے پہلے عراق کو فتح کیا۔ مشرقِ وسطیٰ کے موجودہ نقشے کو ذہن میں رکھا جائے تو فلسطین' اسرائیل' شرقِ اردن' مغربی کنارہ اور لبنان کے ممالک پر مشتمل پورے علاقے کو اُس زمانے میں شامِ عرب یا شام اور اس سے مشرق میں واقع علاقے کو عراقِ عرب یا عراق کہا جاتا تھا' جبکہ عراق کے مزید مشرق میں ایران واقع تھا۔ عراق پر قبضہ کرنے کے بعد ذوالقرنین نے بابل میں اسیر یہودیوں کو آزاد کر دیا اور انہیں اجازت دے دی کہ وہ اپنے ملک واپس جا کر اپنا تباہ شدہ شہر یروشلم دوبارہ آباد کر لیں۔ چنانچہ حضرت عزیرؑ کی قیادت میں یہودیوں کا قافلہ بابل سے واپس یروشلم آیا۔ انہوں نے اپنے اس شہر کو پھر سے آباد کیا اور ہیکل سلیمانی کو بھی از سرِنو تعمیر کیا۔ اس پس منظر میں یہودی ذوالقرنین کو اپنا محسن سمجھتے ہیں اور اسی سبب سے ان کے بارے میں انہوں نے حضورﷺ سے یہ سوال پوچھا تھا۔

ذوالقرنین کی فتوحات کے سلسلے میں تین مہمات کا ذکر تاریخ میں بھی ملتا ہے۔ ان مہمات میں ایران سے مغرب میں بحیرۂ روم (Mediterranian) تک پورے علاقے کی تسخیر' مشرق میں بلوچستان اور مکران تک لشکر کشی اور شمال میں بحیرۂ خزر (Caspian Sea) اور بحیرۂ اسود (Black Sea) کے درمیانی پہاڑی علاقے کی فتوحات شامل ہیں۔ ذوالقرنین کا یہ سلسلہ فتوحات حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت کی فتوحات کے سلسلے سے مشابہ ہے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں بھی جزیرہ نمائے عرب سے مختلف سمتوں میں تین لشکروں نے پیش قدمی کی تھی' ایک لشکر شام اور پھر مصر گیا تھا' دوسرے لشکر نے عراق کے بعد ایران کو فتح کیا تھا' جبکہ تیسرا

لشکر شمال میں کوہ قاف (Caucasus) تک جا پہنچا تھا۔

قدیم روایات میں ذوالقرنین کے بارے میں کچھ ایسی معلومات بھی ملتی ہیں کہ ابتدائی عمر میں وہ ایک چھوٹی سی مملکت کے شہزادے تھے۔ ان کے اپنے ملک میں کچھ ایسے حالات ہوئے کہ کچھ لوگ ان کی جان کے درپے ہو گئے۔ وہ کسی نہ کسی طرح وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور کچھ عرصہ صحرا میں روپوش رہے۔ اسی عرصے کے دوران ان تک کسی نبی کی تعلیمات پہنچیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زرتشت ہی اللہ کے نبی ہوں اور انہی کی تعلیمات سے انہوں نے استفادہ کیا ہو۔ بہرحال قرآن نے ذوالقرنین کا جو کردار پیش کیا ہے وہ ایک نیک اور صالح بندۂ مومن کا کردار ہے اور اس کردار کی خصوصیات تاریخی اعتبار سے اس زمانے کے کسی اور فاتح حکمران پر منطبق نہیں ہوتیں۔

آیت ۸۴ ﴿اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴﴾﴾ ''ہم نے اسے زمین میں تمکن عطا کیا تھا اور اُسے ہر طرح کے اسباب و وسائل مہیا کیے تھے۔''

آیت ۸۵ ﴿فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۵﴾﴾ ''تو اُس نے ایک (مہم کا) سروسامان کیا۔''

آیت ۸۶ ﴿حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ﴾ ''یہاں تک کہ جب وہ سورج کے غروب ہونے کی جگہ تک پہنچا''

یہ ذوالقرنین کی مغربی علاقوں پر لشکر کشی کا ذکر ہے جب وہ پیش قدمی کرتے ہوئے بحیرۂ روم (Mediterranian Sea) کے ساحل تک جا پہنچے۔ چونکہ اُس زمانے میں ان لوگوں کو پوری دنیا کا نقشہ معلوم نہیں تھا اس لیے وہ یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم اس سمت میں دنیا یا زمین کی آخری سرحدوں تک پہنچ گئے ہیں اور اس سے آگے بس سمندر ہی سمندر ہے۔ وہاں ساحل پر کھڑے ہو کر انہیں سورج بظاہر سمندر میں غروب ہوتا ہوا نظر آیا اور اس طرح وہ اس جگہ کو مَغْرِبَ الشَّمْسِ (سورج کے غروب ہونے کی جگہ) سمجھے۔

﴿وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ﴾ ''اُس نے اسے غروب ہوتے ہوئے پایا ایک گدلے چشمے میں''

اس سے Aegean Sea مراد ہے جس کا پانی بہت گدلا ہے۔

﴿وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ؕ﴾ ''اور اُس نے پایا وہاں ایک قوم کو۔''

یعنی اس علاقے کو جب انہوں نے فتح کرلیا تو وہاں بسنے والی قوم ان کی رعایا بن گئی۔

﴿قُلْنَا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِیْهِمْ حُسْنًا ﴿۸۶﴾﴾ ”ہم نے کہا: اے ذوالقرنین! تم چاہو تو انہیں سزا دو اور چاہو تو ان (کے بارے) میں حسن سلوک کا معاملہ کرو۔“

یعنی آپ نے اس علاقے کو بزورِ بازو فتح کیا ہے‘ اب یہاں کے باشندے آپ کے رحم وکرم پر ہیں‘ آپ کو ان پر مکمل اختیار ہے۔ آپ چاہیں تو ان پر سختی کریں اور آپ چاہیں تو ان کے درمیان حسن سلوک کی روایت قائم کریں۔ آیت کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ نے براہِ راست ذوالقرنین کو مخاطب کر کے فرمائی‘ لیکن ضروری نہیں کہ حقیقت میں ایسا ہی ہوا ہو۔ اگر تو وہ نبی تھے (واللہ اعلم) تو یہ ممکن بھی ہے‘ ورنہ اس سے مراد القاء یا الہام بھی ہوسکتا ہے۔ جیسے سورۃ النحل (آیت ۶۸) میں شہد کی مکھی کی طرف وحی کیے جانے کا ذکر ہے۔

آیت ۸۷ ﴿قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ یُرَدُّ اِلٰی رَبِّهٖ فَیُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸۷﴾﴾ ”اُس نے کہا: جس نے ظلم کیا ہم اسے سزا دیں گے‘ پھر وہ لوٹایا جائے گا اپنے رب کی طرف اور وہ اسے بہت سخت عذاب دے گا۔“

یہاں ظلم سے مراد کفر اور شرک بھی ہوسکتا ہے۔

آیت ۸۸ ﴿وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨ الْحُسْنٰی ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا یُسْرًا ﴿۸۸﴾﴾ ”اور جو کوئی ایمان لایا اور اُس نے نیک اعمال کیے تو اُس کے لیے ہے اچھی جزا‘ اور اُس سے ہم بات کریں گے اپنے معاملے میں نرمی سے۔“

یعنی اس مفتوحہ علاقہ میں اپنی رعایا کے اہل ایمان نیک لوگوں سے ہم تمام معاملات میں نرمی سے کام لیں گے اور خراج وغیرہ کی وصولی کے سلسلے میں ان پر سختی نہیں کریں گے۔

آیت ۸۹ ﴿ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾﴾ ”پھر اُس نے ایک (اور مہم کا) سروسامان کیا۔“

مغربی مہم سے فارغ ہونے کے بعد ذوالقرنین نے مشرقی علاقوں کی طرف پیش قدمی کا منصوبہ بنایا۔

آیت ۹۰ ﴿حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ﴾ ”یہاں تک کہ وہ سورج کے طلوع ہونے کی جگہ پر پہنچ گیا“

اس مہم کے سلسلے میں تاریخی طور پر مکران کے علاقے تک ذوالقرنین کی پیش قدمی ثابت ہے۔ (واللہ اعلم!) ممکن ہے ساحل مکران پر کھڑے ہو کر بھی انہوں نے محسوس کیا ہو کہ وہ اس سمت میں بھی زمین کی آخری حد تک پہنچ گئے ہیں۔

﴿وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰی قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿۹۰﴾﴾ ”اُس نے اس کو طلوع ہوتے پایا ایک ایسی قوم پر جس کے لیے ہم نے اس (سورج) کے مقابل کوئی اوٹ نہیں رکھی تھی۔“

اس زمانے میں یہ علاقہ Gedrosia کہلاتا تھا۔ یہاں ایسے وحشی قبائل آباد تھے جو زمین پر صرف دیواریں کھڑی کر کے اپنے گھر بناتے تھے اور اس زمانے تک ان کے تمدن میں گھروں پر چھتیں ڈالنے کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔

آیت ۹۱ ﴿كَذٰلِكَ ؕ﴾ ”(پھر) ایسا ہی ہوا۔“

پھر یہاں بھی ویسا ہی معاملہ ہوا جیسا کہ پہلی مہم کے سلسلے میں ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مکمل فتح عطا فرمائی اور علاقے میں آباد قبائل کے معاملات میں نرمی یا سختی کرنے کا پورا اختیار دیا۔ یہاں بھی ذوالقرنین نے ظالم اور شریر لوگوں کے ساتھ سختی جبکہ نیک اور شریف لوگوں کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔

﴿وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَیْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾﴾ ”اور ہم پوری طرح باخبر تھے اُس کے احوال سے۔“

جو کچھ ذوالقرنین کے پاس تھا اور جن حالات سے اس کو سابقہ پیش آیا ہم اس سے پوری طرح باخبر تھے۔

آیت ۹۲ ﴿ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾﴾ ”پھر اُس نے ایک (اور مہم کا) سروسامان کیا۔“

آیت ۹۳ ﴿حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ بَیْنَ السَّدَّیْنِ﴾ ”یہاں تک کہ جب وہ دو دیواروں کے درمیان پہنچا“

”سد“ دیوار کو کہتے ہیں۔ دو دیواروں سے مراد یہاں دو پہاڑی سلسلے ہیں۔ داہنی طرف مشرق میں بحیرۂ کیپیئن تھا اور دوسری طرف بحیرۂ اسود۔ ان دونوں سمندروں کے ساحلوں کے ساتھ ساتھ دو پہاڑی سلسلے متوازی چلتے ہیں۔ اور ان پہاڑی سلسلوں کی درمیانی گزرگاہ سے

شمالی علاقوں کے وحشی قبائل (یاجوج ماجوج) اس علاقے پر حملہ آور ہوتے تھے۔

﴿وَجَدَ مِنۡ دُوۡنِہِمَا قَوۡمًا ۙ لَّا یَکَادُوۡنَ یَفۡقَہُوۡنَ قَوۡلًا ﴿۹۳﴾﴾ ''اُس نے پایا اُن دونوں سے ورے ایک قوم (کے افراد) کو جو کوئی بات سمجھ نہیں سکتے تھے۔''

گویا یہ بھی ایک غیر متمدن قوم تھی۔ اس قوم کے افراد ذوالقرنین اور ان کے ساتھیوں کی زبان سے قطعاً نا آشنا تھے اور حملہ آور لشکر کے لوگ بھی اس مفتوحہ قوم کی زبان نہیں سمجھ سکتے تھے۔ مگر پھر بھی انہوں نے کسی نہ کسی طرح سے ذوالقرنین کے سامنے اپنا مدعا بیان کر ہی دیا:

آیت ۹۴ ﴿قَالُوۡا یٰذَا الۡقَرۡنَیۡنِ اِنَّ یَاۡجُوۡجَ وَ مَاۡجُوۡجَ مُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ﴾

''انہوں نے کہا: اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج زمین میں بہت فساد مچانے والے لوگ ہیں''

﴿فَہَلۡ نَجۡعَلُ لَکَ خَرۡجًا عَلٰۤی اَنۡ تَجۡعَلَ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَہُمۡ سَدًّا ﴿۹۴﴾﴾ ''تو کیا ہم آپ کو کچھ خراج ادا کریں کہ اس کے عوض آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دیں؟''

یعنی آپ ان پہاڑوں کے درمیان واقع اس واحد قدرتی گزرگاہ کو بند کر دیں تاکہ یاجوج و ماجوج ہم پر حملہ آور نہ ہو سکیں۔ یہ وہی تصور یا اصول تھا جس کے تحت آج کل دریاؤں پر ڈیم تعمیر کیے جاتے ہیں۔ یعنی دو متوازی پہاڑی سلسلوں کے درمیان اگر دریا کی گزرگاہ ہے تو کسی کو مناسب مقام پر مضبوط دیوار بنا کر پانی کا راستہ روک دیا جائے تاکہ دریا ایک بہت بڑی جھیل کی شکل اختیار کر لے۔

یہ یاجوج ماجوج کون ہیں؟ ان کے بارے میں جاننے کے لیے نسل انسانی کی قدیم تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔ قدیم روایات کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کے بعد نسل انسانی آپؑ کے تین بیٹوں سام، حام اور یافث سے چلی تھی۔ ان میں سے سامی نسل تو بہت معروف ہے۔ قومِ عاد، قوم ثمود اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سب سامی نسل میں سے تھے۔ حضرت یافث کی اولاد کے لوگ وسطی ایشیا کے پہاڑی سلسلے کو عبور کر کے شمال کی طرف چلے گئے۔ وہاں سے ان کی نسل بڑھتے بڑھتے شمالی ایشیا اور یورپ کے علاقوں میں پھیل گئی۔ چنانچہ مشرق میں چین اور ہند چینی کی yellow races، مغرب میں روس اور سکنڈے نیوین ممالک کی اقوام، مغربی یورپ کے Anglo Saxons، مشرقی یورپ میں خصوصی طور پر شمالی علاقوں اور صحرائے

گوبی کے علاقوں کی تمام آبادی حضرت یافث کی نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ تورات میں حضرت یافث کے بہت سے بیٹوں کے نام ملتے ہیں۔ ان میں Mosc, Tobal, Gog & Magog وغیرہ قابل ذکر ہیں (ممکن ہے روس کا شہر ماسکو حضرت یافث کے بیٹے ماسک نے آباد کیا ہو)۔ اسی طرح Baltic Sea اور Baltic States کا نام غالباً Tobal کے نام پر ہے۔ بہر حال یورپ کی اینگلوسیکسن اقوام اور تمام Nordic Races یاجوج ماجوج ہی کی نسل سے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ غیر متمدن اور وحشی لوگ تھے جن کا پیشہ لوٹ مار اور قتل و غارت گری تھا۔ وہ اپنے ملحقہ علاقوں پر حملہ آور ہوتے، قتل و غارت کا بازار گرم کرتے اور لوٹ مار کر کے واپس چلے جاتے۔ ان کی اس غارت گری کی جھلک موجودہ دنیا نے بھی دیکھی جب Anglo Saxons نے ایک سیلاب کی طرح یورپ سے نکل کر دیکھتے ہی دیکھتے پورے ایشیا اور افریقہ کو نوآبادیاتی نظام کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ بعدازاں مختلف عوامل کی بنا پر انہیں ان علاقوں سے بظاہر پسپا تو ہونا پڑا مگر حقیقت میں دنیا کے بہت سے ممالک پر بالواسطہ اب بھی ان کا قبضہ ہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک جیسے ادارے ان کی اسی بالواسطہ حکمرانی کو مضبوط کرنے میں ان کی مدد کرتے ہیں۔

قربِ قیامت میں ان قوموں کی ایک اور یلغار ہونے والی ہے۔ اس کی تفصیلات احادیث اور روایات میں اس طرح آئی ہیں کہ قیامت سے قبل دنیا ایک بہت ہولناک جنگ کی لپیٹ میں آ جائے گی۔ اس جنگ کو احادیث میں ''الملحمۃ العظمٰی'' جبکہ بائبل میں Armageddon کا نام دیا گیا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کا علاقہ اس جنگ کا مرکزی میدان بنے گا۔ اس جنگ میں ایک طرف عیسائی دنیا اور تمام یورپی اقوام ہوں گی اور دوسری طرف مسلمان ہوں گے۔ اسی دوران اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایک عظیم لیڈر امام مہدی کی صورت میں عطا کرے گا۔ امام مہدی عرب میں پیدا ہوں گے اور وہ مجدد ہوں گے۔ پھر کسی مرحلے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہو گا۔ خراسان کے علاقے سے مسلمان افواج ان کی مدد کو جائیں گی۔ پھر اس جنگ کا خاتمہ اس طرح ہو گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو قتل کر دیں گے، یہودیوں کا خاتمہ ہو جائے گا اور تمام عیسائی مسلمان ہو جائیں گے۔ یوں اسلام کو عروج ملے گا اور دنیا میں اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی۔ (اللہ تعالیٰ مسلمانانِ پاکستان کو توفیق دے کہ اس سے پہلے وہ یہاں نظام خلافت قائم کر لیں اور ہمسایہ علاقہ خراسان سے جو فوجیں امام مہدی کی مدد کے لیے روانہ ہوں ان میں ہمارے لوگ بھی شامل ہوں۔)

جب ہولناک جنگ اپنے انجام کو پہنچ جائے گی تو اس کے بعد یاجوج ماجوج کی بہت بڑی یلغار ہوگی۔ میرے خیال میں یہ لوگ چین اور ہند چینی وغیرہ علاقوں کی طرف سے حملہ آور ہوں گے۔ یہ لوگ Armageddon میں حصہ نہیں لیں گے بلکہ اس کے بعد اس علاقے پر یلغار کر کے تباہی مچائیں گے۔ سورۃ الانبیاء کی آیات ۹۶'۹۷ اور ۹۸ میں اُن کی اس یلغار کا ذکر قربِ قیامت کے واقعات کے حوالے سے کیا گیا ہے۔

آیت ۹۵ ﴿قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ﴾ ''اُس نے کہا: جو کچھ مجھے دے رکھا ہے اس میں میرے رب نے وہ بہت بہتر ہے''

کہ مجھے تمہارے خراج وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس سے بہتر مال تو میرے رب نے مجھے پہلے ہی عطا کر رکھا ہے۔ بہرحال تمہارے اس مسئلے کو میں حل کیے دیتا ہوں۔ اس جملے سے ذوالقرنین کے کردار کی عکاسی ہوتی ہے۔

﴿فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿٩٥﴾﴾ ''البتہ تم لوگ میری مدد کرو قوت (محنت) کے ذریعے سے' میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط دیوار بنا دوں گا۔''

دیوار بنانے کے لیے جو مادی اسباب و وسائل درکار ہیں وہ میں مہیا کر لوں گا۔ آپ لوگ اس سلسلے میں محنت و مشقت اور افرادی قوت (man power) کے ذریعے میرا ہاتھ بٹاؤ۔

آیت ۹۶ ﴿اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ﴾ ''لاؤ میرے پاس تختے لوہے کے۔''

﴿حَتّٰٓى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ﴾ ''یہاں تک کہ جب اُس نے برابر کر دیا دونوں اونچائیوں کے درمیان (کی جگہ) کو''

جب لوہے کے تختوں کو جوڑ کر انہوں نے دونوں پہاڑوں کے درمیانی درّے میں دیوار کھڑی کر دی تو:

﴿قَالَ انْفُخُوْا﴾ ''اُس نے کہا: اب آگ دہکاؤ!''

اس نے بڑے پیمانے پر آگ جلا کر ان تختوں کو گرم کرنے کا حکم دیا۔

﴿حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا﴾ ''یہاں تک کہ جب بنا دیا اس نے اس کو آگ

(کی مانند)''

جب لوہے کے وہ تختے گرم ہو کر سرخ ہو گئے تو:

﴿قَالَ اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿٩٦﴾﴾ ''اُس نے کہا: لاؤ میرے پاس میں ڈال دوں اس پر پگھلا ہوا تانبا۔''

اور یوں ذوالقرنین نے لوہے کے تختوں اور پگھلے ہوئے تانبے کے ذریعے سے ایک انتہائی مضبوط دیوار بنا دی۔ اس دیوار کے آثار بحیرۂ کیسپین کے مغربی ساحل کے ساتھ داریال اور دربند کے درمیان اب بھی موجود ہیں۔ یہ دیوار پچاس میل لمبی' انتیس فٹ اونچی اور دس فٹ چوڑی تھی۔ آج سے سینکڑوں سال پہلے لوہے اور تانبے کی اتنی بڑی (مصر کے اسوان ڈیم سے بھی بڑی جسے اَسَدّ الاعلٰی کہا جاتا ہے) دیوار تعمیر کرنا یقیناً ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔

آیت ۹۷ ﴿فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿٩٧﴾﴾ ''اب نہ تو وہ (یاجوج ماجوج) اس کے اوپر چڑھ سکیں گے' اور نہ ہی اس میں نقب لگا سکیں گے۔''

آیت ۹۸ ﴿قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ﴾ ''اس نے کہا کہ یہ رحمت ہے میرے رب کی''

اتنا بڑا کارنامہ سر انجام دینے کے بعد بھی ذوالقرنین کوئی کلمہ فخر زبان پر نہیں لائے' بلکہ یہی کہا کہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں' یہ سب اللہ کی مہربانی سے ہی ممکن ہوا ہے۔

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ﴾ ''اور جب آ جائے گا وعدہ میرے رب کا تو وہ کر دے گا اس کو ریزہ ریزہ۔''

چنانچہ امتدادِ زمانہ کے سبب یہ دیوار اب ختم ہو چکی ہے' صرف اس کے آثار موجود ہیں' جن سے اس کے مقام اور سائز وغیرہ کا پتا چلتا ہے۔

﴿وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ﴿٩٨﴾﴾ ''اور میرے رب کا وعدہ سچا ہے۔''

آیت ۹۹ ﴿وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ﴾ ''اور ہم چھوڑ دیں گے ان کو اس دن وہ ایک دوسرے میں گتھم گتھا ہو جائیں گے''

یہ قیامت سے پہلے رونما ہونے والے جنگی واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ قربِ قیامت کے واقعات میں سے ایک اہم واقعہ یاجوج و ماجوج کا ظہور بھی ہے۔ احادیث میں ان کے بارے میں ایسی خبریں ہیں کہ وہ دریاؤں اور سمندروں کا پانی پی جائیں گے اور ہر چیز کو ہڑپ

کر جائیں گے۔ عین ممکن ہے وہ آدم خور بھی ہوں اور ضرورت پڑنے پر انسانوں کو بھی کھا جائیں۔ جیسے آج ہم چینی قوم کو دیکھتے ہیں کہ وہ سانپ‘ بچھو‘ کتا‘ بلی‘ ہر چیز کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔ کثرتِ آبادی کے لحاظ سے بھی یاجوج وماجوج کی بیشتر علامات کا تطابق چینی قوم پر ہوتا نظر آتا ہے۔

یاجوج وماجوج کی یلغار کا نقشہ سورۃ الانبیاء میں اس طرح کھینچا گیا ہے: ﴿وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿٩٦﴾﴾ ”اور وہ ہر پہاڑ کی ڈھلوان سے اترتے ہوئے نظر آئیں گے“۔ ۱۹۶۲ء میں چین بھارت جنگ کے دوران اخباروں نے چینی افواج کے حملوں کی تفصیلات بتاتے ہوئے بھی کچھ ایسی ہی تصویر کشی کی تھی: "Waves after waves of Chinese soldiers were coming down the slopes." بہرحال جس طرح یاجوج وماجوج آج سے ڈھائی ہزار سال پہلے اپنے ملحقہ علاقوں کی مہذب آبادیوں کو تاخت وتاراج کرتے تھے‘ اسی طرح قیامت سے پہلے ایک دفعہ پھر وہ دنیا میں تباہی مچائیں گے اور ان کا ظہور اپنی نوعیت کا ایک بہت اہم واقعہ ہوگا۔

﴿وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿٩٩﴾﴾ ”اور صور میں پھونکا جائے گا‘ پس ہم ان سب کو جمع کر لیں گے۔“

آیت ۱۰۰ ﴿وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا ﴿١٠٠﴾﴾ ”اور اُس روز ہم جہنم کو کافروں کے سامنے لے آئیں گے۔“

کہ دیکھ لو اپنی آنکھوں سے‘ اسے ہم نے تمہارے انجام کے لیے تیار کر رکھا ہے۔

آیت ۱۰۱ ﴿الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَاۗءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ﴿١٠١﴾﴾ ”وہ لوگ جن کی نگاہیں پردے میں تھیں میرے ذکر سے‘ اور وہ سن بھی نہیں سکتے تھے۔“

وہ لوگ جو اندھے اور بہرے ہو کر دنیا سمیٹنے میں لگے ہوئے تھے‘ حقیقی مسبب الاسباب کو بالکل فراموش کر چکے تھے‘ صرف دُنیوی اسباب ووسائل پر بھروسا کرتے تھے اور دنیا میں ان کی ساری تگ ودو مادی منفعت کے حصول کے لیے تھی۔ یہی مضمون اگلے (آخری) رکوع میں بہت تیکھے انداز میں آ رہا ہے۔

آیات ۱۰۲ تا ۱۱۰

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَاۗءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا
جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿١٠٢﴾ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿١٠٣﴾ اَلَّذِيْنَ
ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿١٠٤﴾ اُولٰۗىِٕكَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَاۗىِٕهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿١٠٥﴾ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ
هُزُوًا ﴿١٠٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ
نُزُلًا ﴿١٠٧﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿١٠٨﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا
لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿١٠٩﴾
قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا
لِقَاۗءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿١١٠﴾

اس آخری رکوع میں بہت واضح الفاظ میں بتا دیا گیا ہے کہ اللہ کی نظر میں کون لوگ حقیقی گمراہی اور کفر ودجل میں مبتلا ہیں۔ اگرچہ قربِ قیامت کے زمانے میں ایک شخصِ معین ”دجالِ اکبر“ کا فتنہ اور اس کا ظہور اپنی جگہ ایک حقیقت ہے (یہ اس کی تفصیل کا موقع نہیں) مگر عمومی طور پر دجالیت کا فتنہ یہی ہے کہ انسان حصولِ دنیا میں مشغول ہو کر اس حد تک غافل ہو جائے کہ اُسے نہ تو اپنے دارِ آخرت کی کوئی فکر رہے اور نہ ہی اپنے خالق ومالک کی مرضی ومنشا کا کچھ ہوش رہے۔ وہ اس ”عروسِ ہزار داماد“ کی زلفِ گرہ گیر کا ایسا اسیر ہو کہ اس کی ظاہری دل فریبیوں اور چمک دمک ہی میں کھو کر رہ جائے۔

آیت ۱۰۲ ﴿اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَاۗءَ ۭ﴾ ”کیا کافروں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ میرے ہی بندوں کو میرے مقابلے میں اپنے حمایتی بنا لیں گے؟“

یہ لوگ جن انبیاء ورُسل‘ ملائکہ اور صلحاء کو میرے شریک ٹھہراتے ہیں اور اپنا کارساز سمجھتے ہیں وہ سب میرے بندے ہیں۔ کیا ان کا خیال ہے کہ میرے یہ بندے میرے مقابلے میں ان

کی مدد اور حمایت کریں گے؟ خواہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوں یا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ' میرے یہ بندے میرے مقابلے میں ان کے حامی و مددگار اور حاجت روا ثابت ہوں گے؟

﴿اِنَّآ اَعۡتَدۡنَا جَهَنَّمَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ نُزُلًا ۝١٠٢﴾ ''یقیناً ہم نے تیار کر رکھا ہے جہنم کو ایسے کافروں کی مہمانی کے لیے۔''

آیت ۱۰۳ ﴿قُلۡ هَلۡ نُنَبِّئُكُمۡ بِالۡاَخۡسَرِيۡنَ اَعۡمَالًا ۝١٠٣﴾ 'آپؐ کہیے: کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں؟''

یہ ہے وہ مضمون جسے ابتدا میں اس سورت کا عمود قرار دیا گیا تھا' یعنی دنیا اور اس کی زیب و زینت! اس مضمون کے سائبان کا ایک کھونٹا سورت کے آغاز میں نصب ہے جبکہ دوسرا کھونٹا یہاں ان آیات کی صورت میں۔ ابتدائی آیات میں واضح طور پر بتایا گیا تھا کہ دنیا کی زیب و زینت اور رونقوں پر مشتمل یہ خوبصورت محفل سجائی ہی انسانوں کی آزمائش کے لیے گئی ہے۔ اس کے ذریعے سے انسانوں کے رویوں کی پرکھ پڑتال کرنا اور ان کی جدوجہد کی غرض و غایت کا تعین کرنا مقصود ہے: ﴿اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَى الۡاَرۡضِ زِيۡنَةً لَّهَا لِنَبۡلُوَهُمۡ اَيُّهُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ۝٧﴾۔ اب یہاں آیت زیر نظر میں اُن لوگوں کی نشاندہی کی جا رہی ہے جو اپنے اعمال' اپنی محنت و مشقت' بھاگ دوڑ اور سعی و جُہد میں سب سے زیادہ گھاٹا کھانے والے ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو اس آزمائش میں ناکام ہو کر دنیا کی زیب و زینت ہی میں کھو گئے ہیں۔

جہاں تک محنت اور مشقت کا تعلق ہے وہ تو ہر شخص کرتا ہے۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((كُلُّ النَّاسِ يَغۡدُوۡ فَبَائِعٌ نَفۡسَهٗ ' فَمُعۡتِقُهَا اَوۡ مُوۡبِقُهَا))(١) ''ہر انسان جب صبح کرتا ہے تو خود کو بیچنا شروع کرتا ہے' پھر یا تو وہ اسے آزاد کرا لیتا ہے یا (گناہوں سے) ہلاک کر دیتا ہے''۔ چنانچہ ہر کوئی اپنے آپ کو بیچتا ہے۔ کوئی اپنی طاقت اور قوت بیچتا ہے' کوئی اپنی ذہانت اور صلاحیت بیچتا ہے اور کوئی اپنا وقت اور ہنر بیچتا ہے۔ گویا یہ دنیا محنت' عمل اور کوشش کی دوڑ کا میدان ہے اور ہر انسان اپنے مفاد کے لیے بقدرِ ہمت اس دوڑ میں شامل ہے۔ مگر بدقسمتی سے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی پوری کوشش اور محنت کے باوجود گھاٹے میں رہتے ہیں۔ ان کے لیے خود کو بیچنے کے اس عمل میں کچھ بھی نفع نہیں بلکہ نقصان ہی نقصان ہے' خسارا ہی خسارا ہے۔ تو اللہ کی نظر میں سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے یہ کون لوگ ہیں؟

---

(١) صحیح مسلم' کتاب الطهارة' باب فضل الوضوء۔ وسنن الترمذی' ابواب الدعوات۔

آیت ۱۰۴ ﴿اَلَّذِيۡنَ ضَلَّ سَعۡيُهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا﴾ ''وہ لوگ جن کی سعی و جُہد دنیا ہی کی زندگی میں گم ہو کر رہ گئی''

ایسے لوگ جنہیں آخرت مطلوب ہی نہیں' ان کی ساری تگ و دو اور سوچ بچار دنیا کمانے کے لیے ہے۔ آخرت کے لیے انہوں نے نہ تو کبھی کوئی منصوبہ بندی کی اور نہ ہی کوئی محنت۔ بس برائے نام اور موروثی مسلمانی کا بھرم رکھنے کے لیے کبھی کوئی نیک کام کر لیا' کبھی نماز بھی پڑھ لی اور کبھی روزہ بھی رکھ لیا۔ مگر اللہ کو اصل میں اُن سے مقصود و مطلوب کیا ہے؟ اس بارے میں انہوں نے کبھی سنجیدگی سے سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ ایسے لوگوں کو ان کی محنت کا صلہ حسبِ مشیتِ الٰہی دنیا ہی میں مل جاتا ہے' جبکہ آخرت میں ان کے لیے سوائے جہنم کے اور کچھ نہیں۔ اس مضمون کا ذروۂ سنام سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیات ہیں: ﴿مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡعَاجِلَةَ عَجَّلۡنَا لَهٗ فِيۡهَا مَا نَشَآءُ لِمَنۡ نُّرِيۡدُ ثُمَّ جَعَلۡنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصۡلٰهَا مَذۡمُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ۝١٨ وَمَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعۡيَهَا وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعۡيُهُمۡ مَّشۡكُوۡرًا ۝١٩﴾ ''جو کوئی طلب گار بنتا ہے جلدی والی (دنیا) کا تو ہم اس کو جلدی دے دیتے ہیں اس میں جو کچھ ہم چاہتے ہیں' جس کے لیے چاہتے ہیں' پھر ہم مقرر کر دیتے ہیں اس کے لیے جہنم' وہ داخل ہوگا اس میں ملامت زدہ' دھتکارا ہوا۔ اور جو کوئی آخرت کا طلبگار رہا' اور کوشش کرے اس کے لیے اس کی سی کوشش اور وہ مؤمن بھی ہو' تو وہی لوگ ہوں گے جن کی کوشش کی قدر کی جائے گی''۔ چنانچہ نجاتِ اخروی کا امیدوار بننے کے لیے ہر بندۂ مسلمان کو واضح طور پر اپنا راستہ متعین کرنا ہوگا کہ وہ طالب دنیا ہے یا طالب آخرت؟ جہاں تک دُنیا میں رہتے ہوئے ضروریاتِ زندگی کا تعلق ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیک و بد سب کی پوری ہو رہی ہیں: ﴿كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنۡ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحۡظُوۡرًا ۝٢٠﴾ (بنی اسرائیل) ''ہم سب کو مدد پہنچائے جا رہے ہیں' ان کو بھی اور ان کو بھی' آپؐ کے رب کی عطا سے' اور آپؐ کے رب کی عطا رُکی ہوئی نہیں ہے''۔ لہٰذا انسان کو اپنی ضروریات زندگی کے حصول کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ پر توکل رکھنا چاہیے۔ اُس نے انسان کو دنیا میں زندہ رکھنا ہے تو وہ اس کے کھانے پینے کا بندوبست بھی کرے گا: ﴿وَّيَرۡزُقۡهُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَحۡتَسِبُ ؕ﴾ (الطلاق:٣) ''وہ اس کو وہاں سے رزق دے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہ ہوگا''۔ چنانچہ ایک بندۂ مؤمن کو چاہیے کہ فکرِ دنیا سے بے نیاز ہو کر آخرت کو اپنا مطلوب و مقصود بنائے' اور ان لوگوں کے راستے پر نہ چلے جنہوں نے سراسر گھاٹے کا سودا کیا ہے' جن کی ساری محنت اور تگ و

دو دنیا کی زندگی ہی میں گم ہو کر رہ گئی ہے:

﴿وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾﴾ ''اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔''

ایسے لوگ اپنے کاروبار کی ترقی' جائیدادوں میں اضافے اور دیگر مادی کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے سمجھتے ہیں کہ ان کی محنتیں روز بروز نتیجہ خیز اور کوششیں بارآور ہو رہی ہیں۔

آیت ۱۰۵ ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ﴾ ''یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے انکار کیا اپنے رب کی آیات اور اُس کی ملاقات کا''

ایسے لوگ بے شک اقرار کرتے ہیں کہ وہ اللہ کو اور قرآن کو مانتے ہیں' لیکن اگر حقیقتاً وہ آخرت کو بھلا کر دن رات دنیا سمیٹنے ہی میں مصروف ہیں تو اپنے عمل سے گویا وہ اللہ کی آیات اور آخرت میں اس سے ہونے والی ملاقات کا انکار کر رہے ہیں۔ اللہ کا فیصلہ تو یہ ہے: ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ﴾ (العنکبوت:٦٤) ''یقیناً آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے''۔ لیکن طالبانِ دنیا کا عمل اللہ کی اس بات کی تصدیق کرنے کے بجائے اس کو جھٹلاتا ہے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کی آیات کو اور اس کے سامنے روزِ محشر کی حاضری کو عملی طور پر جھٹلا دیا ہے۔

﴿فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾﴾ ''تو برباد ہو گئے ان کے اعمال اور ہم قائم نہیں کریں گے ان کے لیے قیامت کے دن کوئی وزن۔''

قیامت کے دن ایسے لوگوں کے اعمال کا وزن نہیں کیا جائے گا۔ اگر انہوں نے اپنے دل کی تسلی اور ضمیر کی خوشی کے لیے بھلائی کے کچھ کام کیے بھی ہوں گے تو ایسی نیکیاں جو ایمان اور یقین سے خالی ہوں گی ان کی اللہ کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہو گی۔ چنانچہ ان کی ایسی تمام نیکیاں ضائع کر دی جائیں گی اور میزان میں ان کا وزن کرنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ اس بھیانک انجام کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ دنیا کی آرائش و زیبائش میں گم ہو کر انسان کو نہ اللہ کا خیال رہتا ہے اور نہ آخرت کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ دنیا کی زیب و زینت کے حوالے سے یہ مضمون اس سورت میں بار بار دہرایا گیا ہے (ملاحظہ ہو: آیت ۷' ۲۷ اور ۴۶)۔

آیت ۱۰۶ ﴿ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾﴾ ''ان کا بدلہ جہنم ہے بسبب اس کے کہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیات اور میرے

رسولوںؑ کا مذاق اڑایا۔''

اللہ کی آیات اور رسولوں کے فرمودات کے مطابق تو اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اور دُنیوی زندگی کی کچھ اہمیت نہیں' مگر ان طالبانِ دنیا نے سمجھ رکھا تھا کہ اصل کامیابی اسی دُنیوی زندگی کی ہی کامیابی ہے۔ چنانچہ اسی کامیابی کے حصول کے لیے انہوں نے محنت اور کوشش کی اور اسی زندگی کو سنوارنے کے لیے وہ خود کو ہلکان کرتے رہے۔ آخرت کو لائق اعتناء سمجھا اور نہ ہی اس کے لیے انہوں نے کوئی سنجیدہ تگ و دو کی۔ آخرت کا خیال کبھی آیا بھی تو یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لی کہ ہم نے فلاں فلاں بھلائی کے کام بھی تو کیے ہیں اور پھر ہم حضور ﷺ کے امتی بھی تو ہیں۔ آپؐ ہماری شفاعت فرمائیں گے اور ہم کامیاب و کامران ہو کر جنت میں پہنچ جائیں گے۔ یہ عقیدہ یہودیوں کے عقیدے سے ملتا جلتا ہے۔ وہ بھی دعویٰ کرتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹوں کی مانند ہیں' اس کے لاڈلے اور چہیتے ہیں۔

ان آیات کے حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ بھی توجہ طلب ہے کہ یہاں کفار سے مراد اصطلاحی کفار نہیں' بلکہ ایسے لوگ ہیں جو قانونی طور پر تو مسلمان ہی ہیں' مگر اللہ اور اُس کے رسول کے احکام کو پس پشت ڈال کر سرتاپا دنیا کے طالب بنے بیٹھے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مذکورہ مفہوم میں جو شخص بھی آخرت کے مقابلے میں دنیا کا طالب ہے وہی ان آیات کا مصداق ہے' بظاہر چاہے وہ مسلمان ہو' مسلمانوں کا لیڈر ہو' مذہبی پیشوا ہو یا کوئی بہت بڑا عالم ہو۔ اسی مضمون کو کسی بزرگ نے ''جو دم غافل سو دم کافر'' کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ آخرت کی نجات کے سلسلے میں یہ بات طے کرنا انتہائی ضروری ہے کہ بنیادی طور پر انسان طالبِ دنیا ہے یا طالبِ آخرت!

آخری رکوع کی ان آیات کا سورت کی ابتدائی آیات کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے اور دجالی فتنے سے حفاظت کے لیے ان کی خصوصی اہمیت ہے' چنانچہ حدیث میں ان کو فتنہ دجال سے حفاظت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ابتدائی دس آیات اور ان آخری آیات کو حفظ کر لیا جائے اور کثرت سے ان کی تلاوت کی جائے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے تو جمعہ کے روز پوری سورۃ الکہف کی تلاوت کو بھی معمول بنایا جائے۔

آیت ۱۰۷ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿۱۰۷﴾﴾ ''(اس کے برعکس) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے

ان کی مہمانی کے لیے فردوس کے باغات ہوں گے۔‘‘

جن لوگوں نے ایمان کے تقاضے بھرپور طور پر پورے کیے اور وہ نیک اعمال کرتے رہے ان کے لیے ٹھنڈی چھاؤں والے باغات ہوں گے۔ آج ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ وہ باغات کیسے ہوں گے اور کہاں ہوں گے۔ اس کائنات کی وسعت بے حد وحساب ہے اور جنت کی وسعت بھی ہمارے احاطۂ خیال میں نہیں سما سکتی۔ اس کائنات میں اَن گنت کہکشائیں ہیں اور نہ معلوم اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے کہاں کہاں جنتیں بنا رکھی ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ نچلے درجے والا جنتی اوپر والے جنتی کو ایسے دیکھے گا جیسے آج ہم زمین سے ستاروں کو دیکھتے ہیں۔ بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ اہل جنت کی ابتدائی مہمان نوازی (نُــزُل) یہیں اسی زمین پر ہوگی۔ یعنی ’’قصۂ زمین برسرِ زمین‘‘ ہی طے کیا جائے گا۔

آیت ۱۰۸ ﴿خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا لَا یَبۡغُوۡنَ عَنۡہَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾﴾ ’’وہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے‘ وہاں سے وہ جگہ بدلنا نہیں چاہیں گے۔‘‘

یعنی جنت ایسی جگہ نہیں ہے کہ جہاں رہتے رہتے کسی کا جی اُکتا جائے۔ دنیا میں انسان ہر وقت تغیر وتبدیلی کا خواہاں ہے۔ تبدیلی کی اسی خواہش کے تحت بری سے بری جگہ پر بھی کچھ دیر کے لیے انسان کا دل بہل جاتا ہے جبکہ اچھی سے اچھی جگہ پر بھی مستقل طور پر رہنا پڑے تو بہت جلد اسے اکتاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ ہم کشمیر اور سوئزرلینڈ کو ’’فردوس برروئے زمین‘‘ گمان کرتے ہیں‘ لیکن وہاں کے رہنے والے وہاں کی زمینی وآسمانی آفات سے تنگ ہیں۔ اہلِ جنت مستقل طور پر ایک ہی جگہ رہنے کے باعث اکتائیں گے نہیں اور وہاں سے جگہ بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کریں گے۔

اب اس سورت کی آخری دو آیات آ رہی ہیں جو گویا توحید کے دو بہت بڑے خزانے ہیں۔

آیت ۱۰۹ ﴿قُلۡ لَّوۡ کَانَ الۡبَحۡرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیۡ لَنَفِدَ الۡبَحۡرُ قَبۡلَ اَنۡ تَنۡفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیۡ وَ لَوۡ جِئۡنَا بِمِثۡلِہٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾﴾ ’’(اے نبیﷺ!) آپ کہیے کہ اگر سمندر روشنائی بن جائے میرے رب (کے کلمات کو لکھنے) کے لیے تو یقیناً سمندر ختم ہو جائے گا اس سے پہلے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں اگرچہ اسی کی طرح اور (سمندر) بھی ہم (اس کی) مدد کے لیے لے آئیں۔‘‘

یہاں پر سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت سے پہلے کی آیت کو دوبارہ ذہن میں لائیں:

﴿قُلِ ادۡعُوا اللّٰہَ اَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ ؕ اَیًّامَّا تَدۡعُوۡا فَلَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی ۚ﴾ ’’آپ کہہ دیجیے کہ تم پکارو اللہ (کہہ کر) یا پکارو رحمٰن (کہہ کر)‘ جس (نام) سے بھی تم پکارو اُسی کے ہیں تمام نام اچھے‘‘۔ سورۂ بنی اسرائیل کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے اسماء کا ذکر ہے‘ جبکہ یہاں آیت زیرِنظر میں اللہ تعالیٰ کے کلمات کا ذکر ہے۔ اللہ کے کلمات سے مراد اس کی مختلف النوع مخلوقات ہیں‘ اور اُس کی ہر مخلوق اُس کے ایک کلمۂ کُن کا ظہور ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی جملہ مخلوقات کا احاطہ کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ سورۂ لقمان میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿وَ لَوۡ اَنَّ مَا فِی الۡاَرۡضِ مِنۡ شَجَرَۃٍ اَقۡلَامٌ وَّ الۡبَحۡرُ یَمُدُّہٗ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ سَبۡعَۃُ اَبۡحُرٍ مَّا نَفِدَتۡ کَلِمٰتُ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۲۷﴾﴾ ’’اور اگر زمین کے تمام درخت قلمیں بن جائیں اور سمندر سیاہی ہو‘ اس کے بعد سات سمندر اور ہوں تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہیں ہوں گے۔ یقیناً اللہ غالب‘ حکمت والا ہے۔‘‘

آیت ۱۱۰ ﴿قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰـہُکُمۡ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ۚ﴾ ’’(اے نبیﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ میں تو بس تمہاری ہی طرح کا ایک انسان ہوں‘ مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود بس ایک ہی معبود ہے۔‘‘

﴿فَمَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّہٖ فَلۡیَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا یُشۡرِکۡ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖۤ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾﴾ ’’پس جو کوئی بھی اُمید رکھتا ہو اپنے رب سے ملاقات کی تو اسے چاہیے کہ نیک اعمال کرے اور اپنے ربّ کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ کرے۔‘‘

یعنی عبادت خالص اللہ کی ہو۔ یہ توحید عملی ہے۔ اس بارے میں سورۂ بنی اسرائیل آیت ۲۳ میں یوں فرمایا گیا ہے: ﴿وَ قَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ﴾ ’’اور فیصلہ کر دیا ہے آپ کے رب نے کہ تم لوگ نہیں عبادت کرو گے کسی کی سوائے اُس کے‘‘۔ سورۃ الکہف کی اس آخری آیت اور سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت کا بھی آپس میں معنوی ربط وتعلق ہے۔ موازنہ کے لیے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ملاحظہ کیجیے: ﴿وَ قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ لَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ وَ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ کَبِّرۡہُ تَکۡبِیۡرًا ﴿۱۱۱﴾﴾ ’’اور کہہ دیجیے کہ کُل حمد اور کُل شکر اللہ کے لیے ہے جس نے نہیں بنائی کوئی اولاد اور نہیں ہے اس کا کوئی شریک بادشاہی میں‘ اور نہ ہی اس کا کوئی دوست ہے کمزوری کی وجہ سے اور اُس کی تکبیر کرو جیسے کہ تکبیر کرنے کا حق ہے‘‘۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا بلند مقام اور اُس کی شان بیان کر کے شرک

کی نفی کی گئی ہے۔ دراصل اللہ کے ساتھ شرک کی دو صورتیں ہیں۔ یا تو اللہ کو مرتبہ الوہیت سے نیچے اتار کر مخلوقات کے ساتھ کھڑا کر دیا جاتا ہے یا پھر مخلوقات کی صف میں سے کسی کو اٹھا کر اللہ کے برابر بٹھا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت میں اللہ کی کبریائی کا اعلان کرنے کا حکم دے کر شرک کی پہلی صورت کا ابطال کیا گیا ہے جبکہ سورۃ الکہف کی آخری آیت میں شرک کی دوسری صورت یعنی مخلوقات میں سے کسی کو اللہ کے برابر کرنے کی نفی کی گئی ہے۔

دیکھا جائے تو اللہ کی مخلوق میں سے اس کے شریک بنانے کی روایت ہر زمانے میں رہی ہے۔ عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا درجہ دے دیا اور اہلِ عرب نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دے دیا۔ ہمارے ہاں بھی بعض لوگوں نے حضور ﷺ کو (نعوذ باللہ) خدا بنا دیا: ؎

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر
اُتر پڑا وہ مدینے میں مصطفیٰؐ ہو کر!

اور کسی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا کی ذات سے ملا دیا:

ہر چند علیؓ کی ذات نہیں ہے خدا کی ذات
لیکن نہیں ہے ذاتِ خدا سے جدا علیؓ

اور مرزا غالبؔ تو اس سلسلے میں یہاں تک کہہ گئے:

غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بو ترابؓ میں

یعنی جب میں ابوتراب (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کی بندگی کرتا ہوں تو درحقیقت اللہ ہی کی بندگی کر رہا ہوتا ہوں۔ اسی طرح آغا خانیوں کے ہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ''دشم اوتار'' قرار دیا گیا۔ ہندوؤں کے ہاں نو (۹) اوتار تسلیم کیے جاتے تھے' انہوں نے حضرت علیؓ کو 'دسواں اوتار' مان لیا۔ **اعاذنا اللّٰہ من ذٰلک!!**

بارک اللّٰہ لی ولکم فی القرآن العظیم ' ونفعنی وایاکم بالآیات والذِّکر الحکیم oo

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

بقیہ: عرضِ احوال

چھ سالہ دورِ اقتدار میں اہلِ افغانستان کو امن و انصاف مہیا کیا' انہیں دہشت گردی سے نجات دلائی اور پھر امریکی یلغار پر اپنے ملک کے چپے چپے کا دفاع بھی کیا۔ پاکستان کی سلامتی کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو طالبان کا چند سالہ دورِ اقتدار افغانستان کے تمام حکمرانوں کے ادوار سے بہتر رہا ہے۔ انہوں نے کبھی پاکستان سے اپنے مخلصانہ تعلق اور اہلِ پاکستان سے اپنے والہانہ لگاؤ پر آنچ نہ آنے دی۔ ظاہر ہے کہ اس کی بڑی وجہ نظریاتی وابستگی تھی۔

امریکا نے افغان قوم کی تاریخ سے صرفِ نظر کیا اور فوجی طاقت اور ٹیکنالوجی کی برتری کے نشے میں افغانستان پر یلغار کر دی۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ طاقت کے ذریعے اپنی برتری قائم رکھ سکتا ہے' مگر افغانوں نے اُس کی یہ غلط فہمی دور کر دی۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ امریکا کی غلط فہمی سے پیدا ہونے والی فکر ہماری حکومتوں پر بھی حاوی ہوتی جا رہی ہے۔ اسی لیے ہم نائن الیون کے بعد غیر دانشمندانہ فیصلے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ طالبان کے مقابلے کے لیے افغان فوج کو تربیت دینے کا فیصلہ امریکی انخلاء کے بعد افغانستان کو خانہ جنگی میں جھونک دے گا۔ امریکا یہی چاہتا ہے۔ اس کی بجائے' ہمیں تاریخ کے اس نازک موڑ پر امریکا کو صاف صاف بتا دینا چاہیے کہ اب ۱۹۹۰ء جیسی سازشیں کام نہ آئیں گی' جب امریکا نے سازش کے تحت افغانوں کو لڑایا اور آٹھ سال تک خانہ جنگی ہوتی رہی۔ قانونِ فطرت ہے کہ دو متحارب قوتوں میں سے کامیاب قوت ہی امن کی راہوں کا تعین کرتی ہے۔ افغانستان میں امریکا ایک مرتبہ پھر اِس قانون کو پاؤں تلے روندنا چاہتا ہے۔ آج کی کامیاب قوت طالبان ہیں۔ انہیں حق پہنچتا ہے کہ وہ حکومت بنانے میں بھرپور حصہ لیں اور اسلامی امارت قائم کریں' جو دنیا بھر کے لیے ایک مثال ہو۔ امریکا اور ہمارے حکمران یہ سمجھ لیں کہ تاریخ کے دھارے کو موڑنا ہمارے بس میں نہیں۔ دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ قانونِ فطرت کو روبہ عمل آنے دیا جائے۔ یعنی افغانستان میں طالبان کی قیادت میں وسیع البنیاد حکومت کے قیام کی راہ ہموار کی جائے تاکہ طالبان اور افغانستان کی دیگر قوتیں مل کر ایک مضبوط مستحکم اسلامی حکومت قائم کر سکیں۔ اِس سے افغانستان کا دفاع بھی مضبوط ہوگا اور ہماری مغربی سرحد بھی محفوظ ہوگی' پھر اِسی سے افغانستان میں بھارتی اثر ورسوخ کا بھی خاتمہ ہوگا۔ بصورت دیگر ہماری مغربی سرحد پر مستقلاً ایسی مشکل پیدا ہو جائے گی کہ ہم اُس سے کبھی اپنا دامن نہ چھڑا سکیں گے۔

فتنۂ انکارِ حدیث

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

سورۃ القیامہ (آیات ۱۶ تا ۱۹) میں ارشاد ہوا:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿١٦﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿١٧﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿١٨﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿١٩﴾﴾

’’(اے نبی ﷺ) اِس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو۔ اِس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں اُس وقت تم اس کی قراءت کو غور سے سنتے رہو۔ پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔‘‘

اِس سے گمان ہوتا ہے، اور بعض اکابر مفسرین نے بھی اِس گمان کا اظہار کیا ہے، کہ غالباً ابتدائی زمانے میں رسول اللہ ﷺ نزولِ وحی کے دوران ہی میں قرآن کی کسی آیت یا کسی لفظ یا کسی حکم کا مفہوم بھی جبریل علیہ السلام سے دریافت کر لیتے تھے۔ اس لیے حضور ﷺ کو نہ صرف ہدایت کی گئی کہ جب وحی نازل ہو رہی ہو اُس وقت آپ خاموشی سے اس کو سنیں، اور نہ صرف اطمینان دلایا گیا کہ اس کا لفظ لفظ ٹھیک ٹھیک آپ کے حافظہ میں محفوظ کر دیا جائے گا اور قرآن کو آپ ٹھیک اسی طرح پڑھ سکیں گے جس طرح وہ نازل ہوا ہے، بلکہ ساتھ ساتھ یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم اور ہر ارشاد کا منشا اور مدعا بھی پوری طرح آپ کو سمجھا دیا جائے گا۔

یہ ایک بڑی اہم آیت ہے جس سے چند ایسی اصولی باتیں ثابت ہوتی ہیں جنہیں اگر آدمی اچھی طرح سمجھ لے تو اُن گمراہیوں سے بچ سکتا ہے جو پہلے بھی بعض لوگ پھیلاتے رہے ہیں اور آج بھی پھیلا رہے ہیں۔

اوّلاً، اِس سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے آپ ﷺ کو ایسا علم دیا جاتا تھا جو قرآن میں درج نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن کے احکام و فرامین، اس کے

اشارات، اس کے الفاظ اور اس کی مخصوص اصطلاحات کا جو مفہوم و مدعا حضور ﷺ کو سمجھایا جاتا تھا وہ اگر قرآن ہی میں درج ہوتا تو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس کا مطلب سمجھا دینا یا اس کی تشریح کر دینا بھی ہمارے ذمہ ہے، کیونکہ وہ تو پھر قرآن ہی میں مل جاتا۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مطالب قرآن کی تفہیم و تشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی جاتی تھی وہ بہرحال الفاظ قرآن کے ماسوا تھی۔ یہ وحی خفی کا ایک اور ثبوت ہے جو ہمیں قرآن سے ملتا ہے۔ (قرآن مجید سے اس کے مزید ثبوت ہم نے اپنی کتاب ’’سنت کی آئینی حیثیت‘‘ میں صفحات ۹۴ تا ۹۵ اور صفحات ۱۱۸ تا ۱۲۵ میں پیش کر دیے ہیں۔)

ثانیاً، قرآن کے مفہوم و مدعا اور اُس کے احکام کی یہ تشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو بتائی گئی تھی آخر اسی لیے تو بتائی گئی تھی کہ آپ ﷺ اپنے قول اور عمل سے اِس کے مطابق لوگوں کو قرآن سمجھائیں اور اس کے احکام پر عمل کرنا سکھائیں۔ اگر یہ اس کا مدعا نہ تھا اور یہ تشریح آپ ﷺ کو صرف اس لیے بتائی گئی تھی کہ آپ ﷺ اپنی ذات کی حد تک اس علم کو محدود رکھیں تو یہ ایک بے کار کام تھا، کیونکہ فرائضِ نبوت کی ادائیگی میں اس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ اس لیے صرف ایک بے وقوف آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تشریحی علم سرے سے کوئی شرعی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے خود سورۃ النحل آیت ۴۴ میں فرمایا ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (اور اے نبی ﷺ! یہ ذکر ہم نے تم پر اس لیے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے)۔ قرآن میں چار جگہ اللہ تعالیٰ نے صراحت فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا کام صرف کتاب اللہ کی آیات سنا دینا ہی نہ تھا بلکہ اس کی تعلیم دینا بھی تھا۔ (البقرۃ آیات ۱۲۹ اور ۱۵۱، آل عمران آیت ۱۶۴، الجمعہ آیت ۲)۔ ان سب آیات کی تشریح ہم ’’سُنّت کی آئینی حیثیت‘‘ میں صفحات ۷۴ سے ۷۷ تک تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں۔

اس کے بعد کوئی ایسا آدمی جو قرآن کو مانتا ہو اس بات کو تسلیم کرنے سے کیسے انکار کر سکتا ہے کہ قرآن کی صحیح و مستند، بلکہ فی الحقیقت سرکاری تشریح صرف وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول اور عمل سے فرما دی ہے، کیونکہ وہ آپ ﷺ کی ذاتی تشریح نہیں ہے بلکہ خود قرآن کے نازل کرنے والے خدا کی بتائی ہوئی تشریح ہے۔ اس کو چھوڑ کر یا اس سے ہٹ کر جو شخص بھی قرآن کی کسی آیت یا اس کے کسی لفظ کا کوئی من مانا مفہوم بیان کرتا ہے وہ ایسی جسارت کرتا

ہے جس کا ارتکاب کوئی صاحبِ ایمان آدمی نہیں کرسکتا۔

ثالثاً‘ قرآن کا سرسری مطالعہ بھی اگر کسی شخص نے کیا ہو تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں بکثرت باتیں ایسی ہیں جنہیں ایک عربی دان آدمی محض قرآن کے الفاظ پڑھ کر یہ نہیں جان سکتا کہ ان کا حقیقی مدعا کیا ہے اور ان میں جو حکم بیان کیا گیا ہے اس پر کیسے عمل کیا جائے۔ مثال کے طور پر لفظ صلوٰۃ ہی کو لے لیجیے۔ قرآنِ مجید میں ایمان کے بعد اگر کسی عمل پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے تو وہ صلوٰۃ ہے۔ لیکن محض عربی لغت کی مدد سے کوئی شخص اس کا مفہوم تک متعین نہیں کرسکتا۔ قرآن میں اس کا ذکر بار بار دیکھ کر زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ سمجھ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ عربی زبان کے اس لفظ کو کسی خاص اصطلاحی معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور اس سے مراد غالباً کوئی خاص فعل ہے جسے انجام دینے کا اہلِ ایمان سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن صرف قرآن کو پڑھ کر کوئی عربی دان یہ طے نہیں کرسکتا کہ وہ خاص فعل کیا ہے اور کس طرح اسے ادا کیا جائے؟ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن کے بھیجنے والے نے اپنی طرف سے ایک معلّم کو مقرر کر کے اپنی اس اصطلاح کا مفہوم اسے ٹھیک ٹھیک نہ بتایا ہوتا اور صلوٰۃ کے حکم کی تعمیل کرنے کا طریقہ پوری وضاحت کے ساتھ اسے نہ سکھا دیا ہوتا تو کیا صرف قرآن کو پڑھ کر دنیا میں کوئی دو مسلمان بھی ایسے ہو سکتے تھے جو حکم صلوٰۃ پر عمل کرنے کی کسی ایک شکل پر متفق ہو جاتے؟ آج ڈیڑھ ہزار برس سے مسلمان نسل در نسل ایک ہی طرح جو نماز پڑھتے چلے آ رہے ہیں‘ اور دنیا کے ہر گوشے میں کروڑوں مسلمان جس طرح نماز کے حکم پر یکساں عمل کر رہے ہیں‘ اس کی وجہ یہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ پر صرف قرآن کے الفاظ ہی وحی نہیں فرمائے تھے بلکہ ان الفاظ کا مطلب بھی آپ ﷺ کو پوری طرح سمجھا دیا تھا‘ اور اسی مطلب کی تعلیم آپ ﷺ ان سب لوگوں کو دیتے چلے گئے جنہوں نے قرآن کو اللہ کی کتاب اور آپ ﷺ کو اللہ کا رسول مان لیا۔

رابعاً‘ قرآن کے الفاظ کی جو تشریح اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو بتائی اور رسول ﷺ نے اپنے قول اور عمل سے اس کی جو تعلیم امت کو دی‘ اس کو جاننے کا ذریعہ ہمارے پاس حدیث وسنت کے سوا کوئی نہیں ہے۔ حدیث سے مراد وہ روایات ہیں جو حضور ﷺ کے اقوال وافعال کے متعلق سند کے ساتھ اگلوں سے پچھلوں تک منتقل ہوئیں۔ اور سنت سے مراد وہ طریقہ ہے جو حضور ﷺ کی قولی و عملی تعلیم سے مسلم معاشرے کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں رائج ہوا‘ جس کی

تفصیلات معتبر روایتوں سے بھی بعد کی نسلوں کو اگلی نسلوں سے ملیں‘ اور بعد کی نسلوں نے اگلی نسلوں میں اس پر عملدرآمد ہوتے بھی دیکھا۔ اس ذریعہ علم کو قبول کرنے سے جو شخص انکار کرتا ہے وہ گویا یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ﴾ فرما کر قرآن کا مطلب اپنے رسول ﷺ کو سمجھا دینے کی جو ذمہ داری لی تھی اسے پورا کرنے میں‘ معاذ اللہ‘ وہ ناکام ہو گیا‘ کیونکہ یہ ذِمہ داری محض رسول کو ذاتی حیثیت سے مطلب سمجھانے کے لیے نہیں لی گئی تھی‘ بلکہ اس غرض کے لیے لی گئی تھی کہ رسول کے ذریعہ پوری امت کو کتابِ الٰہی کا مطلب سمجھایا جائے‘ اور حدیث وسنت کے ماخذِ قانون ہونے کا انکار کرتے ہی آپ سے آپ یہ لازم آ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکا ہے‘ اعاذنا اللہ من ذالک۔ اس کے جواب میں جو شخص یہ کہتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے حدیثیں گھڑ بھی تو لی تھیں‘ اس سے ہم کہیں گے کہ حدیثوں کا گھڑا جانا خود اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ آغازِ اسلام میں پوری امت رسول اللہ ﷺ کے اَقوال و اَعمال کو قانون کا درجہ دیتی تھی‘ ورنہ آخر گمراہی پھیلانے والوں کو جھوٹی حدیثیں گھڑنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟ جعل ساز لوگ وہی سکے تو جعلی بناتے ہیں جن کا بازار میں چلن ہو۔ جن نوٹوں کی بازار میں کوئی قیمت نہ ہو انہیں کون بے وقوف جعلی طور پر چھاپے گا؟ پھر ایسی بات کہنے والوں کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ اس امت نے اوّل روز سے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ جس ذاتِ پاک کے اقوال وافعال قانون کا درجہ رکھتے ہیں اس کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے‘ اور جتنا جتنا غلط باتوں کے اس ذات کی طرف منسوب ہونے کا خطرہ بڑھتا گیا اتنا ہی اس امت کے خیر خواہ اس بات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرتے چلے گئے کہ صحیح کو غلط سے ممیّز کیا جائے۔ صحیح و غلط روایات کی تمیز کا یہ علم ایک بڑا عظیم الشان علم ہے جو مسلمانوں کے سوا دنیا کی کسی قوم نے آج تک ایجاد نہیں کیا۔ سخت بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اس علم کو حاصل کیے بغیر مغربی مستشرقین کے بہکائے میں آ کر حدیث وسنت کو ناقابلِ اعتبار ٹھہراتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اپنی اس جاہلانہ جسارت سے وہ اسلام کو کتنا بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں۔

(انتخاب: انجینئر حافظ نوید احمد)

فرائض کا التزام اور رسول اللہ ﷺ کی جامع نصیحتیں

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کا ۴/اپریل ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (البقرۃ)

عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ الْاَنْصَارِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا:

اَنَّ رَجُلًا سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ فَقَالَ: اَرَاَیْتَ اِذَا صَلَّیْتُ الصَّلَوَاتِ الْمَکْتُوْبَاتِ، وَصُمْتُ رَمَضَانَ، وَاَحْلَلْتُ الْحَلَالَ، وَحَرَّمْتُ الْحَرَامَ، وَلَمْ اَزِدْ عَلٰی ذٰلِکَ شَیْئًا، اَاَدْخُلُ الْجَنَّۃَ؟ قَالَ: ((نَعَمْ)) قَالَ: وَاللّٰہِ لَا اَزِیْدُ عَلٰی ذٰلِکَ شَیْئًا (۱)

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الایمان الذی یدخل بہ الجنۃ۔

ابوعبداللہ سیدنا جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

’’ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: ذرا غور فرمایئے! اگر میں (صرف) فرض نمازیں ادا کروں، (صرف) رمضان کے روزے رکھوں، حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھوں اور اس پر کسی عمل کا اضافہ نہ کروں تو کیا میں جنت میں جاسکوں گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’ہاں!‘‘ اُس شخص نے کہا: اللہ کی قسم، میں اس پر کسی چیز کا اضافہ نہیں کروں گا۔‘‘

عَنْ اَبِیْ مَالِكٍ الْحَارِثِ بْنِ عَاصِمٍ الْاَشْعَرِیِّ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ:

((اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَاُ الْمِیْزَانَ، وَسُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَاٰنِ مَا بَیْنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، وَالصَّلَاۃُ نُوْرٌ، وَالصَّدَقَۃُ بُرْھَانٌ، وَالصَّبْرُ ضِیَاءٌ، وَالْقُرْآنُ حُجَّۃٌ لَکَ اَوْ عَلَیْکَ، کُلُّ النَّاسِ یَغْدُوْ، فَبَائِعٌ نَفْسَہٗ، فَمُعْتِقُھَا اَوْ مُوْبِقُھَا)) (۱)

سیدنا ابومالک حارث بن عاصم اشعری ؓ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

’’پاکیزگی نصف ایمان ہے، الحمد للہ کا کلمہ ترازو کو بھر دے گا (یعنی نیکی کے پلڑے کو وزنی کرے گا)، سبحان اللہ اور الحمد للہ یہ دونوں کلمے زمین و آسمان کے مابین خلا کو پُر کر دیتے ہیں۔ نماز (نمازی کے لیے) نور ہے، صدقہ (صدقہ کرنے والے کے لیے ایمان کی) دلیل ہے، اور صبر (صبر کرنے والے کے لیے) روشنی ہے اور قرآن تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف دلیل ہوگا۔ ہر شخص روزانہ اپنا سودا کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں یا تو خود کو (جہنم سے) آزاد کرا لیتا ہے یا خود کو تباہ کر بیٹھتا ہے۔‘‘

معزز سامعین کرام!

احادیثِ نبویہ کے بارے میں، میں نے ایک بات اس سے پہلے بھی کہی تھی کہ اگر ہم اس بات کو پیشِ نظر نہ رکھیں کہ احادیث کس پس منظر میں اور کس سے مخاطب ہو کر کہی گئی ہیں اور کسی ایک حدیث کے اوپر اپنی نگاہ جما کر سارے کا سارا دین اسی سے اخذ کرنے کی کوشش کریں تو معاملہ غلط ہو جائے گا اور بات گمراہی تک چلی جائے گی۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب الطھارۃ، باب فضل الوضوء۔

مثلاً ایمان اور اسلام کی بحث میں ہم یہ حدیث پڑھ چکے ہیں: ((مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ))(۱) ''جس نے لا اِلٰہ اِلا اللہ کہا پس وہ جنت میں داخل ہوگیا''۔ اب اگر صرف اس ایک حدیث پر نظر مرکوز کرلیں تو پھر محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا بھی ضروری نہ رہا اور کوئی عمل بھی ضروری نہ رہا' حالانکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اس حدیث کا مفہوم اور حاصل یہ ہے کہ جو شخص خلوصِ نیت اور مکمل قلبی یقین کے ساتھ لا اِلٰہ اِلا اللہ کہہ رہا ہے' اس کے سارے تقاضوں کو مانتا بھی ہے اور پورا بھی کرتا ہے تو جنت اُس کا ٹھکانا ہوگی۔

احادیث کے پس منظر اور مخاطبین کا جاننا ضروری ہے

آج ہمارے زیر مطالعہ اربعین نووی کی حدیث ۲۲ ہے اور اس کے مضمون سے بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص فرد ہے جو حضور اکرم ﷺ سے مخاطب ہے اور آپؐ اس کے احوال سے بھی بخوبی واقف ہیں —— آیئے اس حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن جابر بن عبداللہ انصاری ؓ —— یہ دونوں باپ بیٹا چونکہ صحابی ہیں' اس لیے ہم ''رضی اللہ تعالیٰ عنہما'' کہیں گے —— بیان کرتے ہیں: اَنَّ رَجُلًا سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: ''ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کرتے ہوئے یہ عرض کیا:'' اَرَاَیْتَ اِذَا صَلَّیْتُ الصَّلَوَاتِ الْمَکْتُوْبَاتِ '' (اے نبی ﷺ!) دیکھئے جب میں فرض نمازیں ادا کردوں' وَصُمْتُ رَمَضَانَ '' اور رمضان المبارک کے (فرض) روزے رکھوں' وَاَحْلَلْتُ الْحَلَالَ، وَحَرَّمْتُ الْحَرَامَ '' اور حلال ہی پر قائم رہوں اور حرام سے مجتنب رہوں' وَلَمْ اَزِدْ عَلٰی ذٰلِکَ شَیْئًا '' اور اس پر میں کسی چیز کا اضافہ نہ کروں' اَاَدْخُلُ الْجَنَّةَ؟ '' تو کیا میں جنت میں داخل ہو جاؤں گا؟'' قَالَ: ((نَعَمْ)) حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہاں!'' اس پر اُس شخص نے کہا: وَاللّٰهِ لَا اَزِیْدُ عَلٰی ذٰلِکَ شَیْئًا ''اللہ کی قسم! میں اس پر کسی چیز کا اضافہ نہیں کروں گا۔''

اس حدیث میں نہ تو ایمان زیر بحث ہے' نہ جہاد فی سبیل اللہ کا تذکرہ ہے۔ ان

(۱) صحیح ابن حبّان' ح:۱۵۱' عن جابر بن عبداللہ ؓ' ح:۱۶۹' عن ابی ذر ؓ۔ المعجم الاوسط للطبرانی:۳/۴۶ و ۳/۲۰۵ و ۲/۳۲۸۔

کے علاوہ عبادات میں سے زکوٰۃ اور حج بھی اس حدیث میں بیان نہیں ہوئے۔ اسی طرح اس میں شہادتَین کا بھی ذکر نہیں اور یقین والے ایمان کی بھی تاکید نہیں۔ چنانچہ جیسا کہ میں قبل ازیں بتا چکا ہوں' اگر آپ صرف ایک حدیث پر نگاہ مرکوز کر کے اسے عمومی حیثیت دے دیں گے تو وہ گمراہی پر منتج ہوسکتی ہے۔ زیر مطالعہ حدیث کو یوں سمجھئے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک معیّن فرد ہے' جو یہ سوال کر رہا ہے اور آپؐ جانتے ہیں کہ وہ صاحبِ ایمان ہے' اس کے دل میں بھی ایمان موجود ہے اور وہ کلمہ شہادت بھی ادا کرتا ہے —— حضور ﷺ کی نگاہوں سے یہ معاملات پوشیدہ نہیں تھے' کسی کے باطن کی کیفیت بھی آپؐ پر عیاں ہوسکتی ہے —— پھر ہوسکتا ہے کہ وہ نادار شخص ہو جس کے لیے زکوٰۃ اور حج کا سوال ہی نہیں ہے۔ وہ صاحبِ نصاب نہیں ہے' اس لیے بالفعل اس کے اوپر زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کے لیے حج کا امکان ہے' اس لیے کہ وہ ﴿مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا﴾ کے ذیل میں نہیں آتا۔ اس کے پاس اخراجاتِ سفر اور زادِ راہ کے لیے کوئی روپیہ پیسہ نہیں ہے۔ ایسا شخص سوال کر کے سمجھنا یہ چاہتا ہے کہ عبادات کے ضمن میں آیا یہ فرائض کفایت کر جائیں گے یا ان کے اوپر نوافل کا اضافہ لازمی ہے؟

نفلی عبادات میں اعتدال لازم ہے

عام طور پر مذہبی مزاج کے لوگوں میں یہ سوال بہت اہمیت رکھتا ہے' اس لیے کہ فرائض کی ادائیگی کو وہ کافی نہیں سمجھتے جب تک کہ ان فرائض کے ساتھ کوئی نوافل اور اضافی عبادات نہ ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے بعض ایسے بھی تھے جو ساری ساری رات اپنے رب کے حضور کھڑے رہتے تھے۔ اس ضمن میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ کی مثال میں آپ کو کئی مرتبہ دے چکا ہوں۔

حضرت عبداللہؓ کے بارے میں آتا ہے کہ ساری رات نوافل پڑھتے اور روزانہ روزہ رکھتے تھے۔ ان کو نہ بیوی سے کوئی سروکار تھا اور نہ دنیا کے کسی اور معاملے سے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو ان کے اس معمول کا پتا چلا تو آپؐ نے انہیں بلا کر پوچھا: ((یَا عَبْدَ اللّٰهِ اَلَمْ اُخْبَرْ اَنَّکَ تَصُوْمُ النَّهَارَ وَتَقُوْمُ اللَّیْلَ)) ''اے عبداللہ! مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم

ہر روز روزہ رکھتے ہو اور پوری پوری رات (نفل میں) قیام کرتے ہو'' —— آپؐ نے عرض کیا: بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ''ایسا ہی ہے یارسول اللہ!'' آپؐ نے فرمایا: ((فَلَا تَفْعَلْ)) ''تو ایسا ہرگز مت کرو!'' ((صُمْ وَاَفْطِرْ وَقُمْ وَنَمْ)) ''روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو' قیام بھی کرو اور نیند بھی کرو!'' ((فَاِنَّ لِجَسَدِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَیْنِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِکَ عَلَیْکَ حَقًّا))(۱) ''اس لیے کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے' اور تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے' اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے۔''

اس حوالے سے میں یہ واقعہ بھی آپ کو سنا چکا ہوں کہ تین صحابہؓ نے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے دریافت کیا کہ حضورﷺ رات کو کتنی دیر جاگ کر نوافل پڑھتے ہیں اور کتنی دیر آرام فرماتے ہیں؟ اور مہینے میں کتنے روزے رکھتے ہیں اور کتنے دن افطار کرتے ہیں؟ وغیرہ۔ جب ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے ان صحابہ کو رسول اللہﷺ کے معمولات بتا دیے تو انہوں نے سوچا کہ یہ عبادات تو کم ہیں۔ گویا ان کا گمان یہ تھا کہ حضورﷺ رات کو ایک لمحہ کے لیے بھی کمر بستر پر نہیں لگاتے ہوں گے اور آپؐ مسلسل روزے رکھتے ہوں گے' کبھی ناغہ نہیں کرتے ہوں گے۔ انہوں نے معمولاتِ رسول اللہﷺ کو قلیل سمجھا' مگر انہوں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تھپکی دی کہ نبی اکرمﷺ تو معصوم عن الخطا ہیں اور آپؐ سے نہ کبھی کوئی گناہ سرزد ہوا ہے اور نہ آئندہ ہونے کا امکان ہے —— اگر امکان ہوتا بھی تو اللہ تعالیٰ پہلے ہی معاف کر چکا ہے: ﴿...... لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ﴾ (الفتح:۲) ''......تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی اگلی اور پچھلی خطائیں بخش دے'' —— جبکہ ہم تو گناہگار ہیں' اس لیے ہمارے لیے اتنی عبادت کافی نہیں ہے۔ تو ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ساری رات نوافل ادا کروں گا' کمر بستر سے نہیں لگاؤں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا' کبھی ناغہ نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا کہ میں ساری عمر شادی بیاہ کے چکر میں نہیں پڑوں گا —— ظاہر بات ہے کہ کنبہ اور خاندان اور پھر ان کے ساتھ سو طرح کے جو جھمیلے

(۱) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب لزوجك علیك حق۔

ہوتے ہیں' ان کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے لو لگانا مشکل ہو جاتا ہے —— حضور اکرمﷺ کو جب اس سارے معاملے کی خبر ہوئی تو آپؐ نے ان کو بلا کر ڈانٹا اور آپؐ نے انتہائی غیر معمولی الفاظ ارشاد فرمائے:

((اَمَا وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَخْشَاکُمْ لِلّٰہِ وَاَتْقَاکُمْ لَہٗ ' لٰکِنِّیْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاُصَلِّیْ وَاَرْقُدُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ ' فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ))(۱)

''اللہ کی قسم! میں تم میں سے سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس کا تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں' لیکن (جان لو) میں روزہ رکھتا بھی ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں' اور (رات کو) نماز بھی پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں' اور میں نے عورتوں سے شادیاں بھی کی ہیں۔ پس جس کو میری سنت پسند نہیں اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔''

فرائض اور نوافل میں نسبت و تناسب کو ملحوظ رکھنا

اس ضمن میں اہم بات یہ ہے کہ دین اور عبادات کے معاملے میں دو چیزیں دیکھنی ضروری ہیں' جبکہ عام طور پر لوگوں کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ صرف ایک چیز پر نگاہ ڈال لیتے ہیں کہ یہ چیز حضور اکرمﷺ سے ثابت ہے۔ لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ کتنی ثابت ہے۔ یہ دوسری بات بھی اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ اُسوۂ رسولﷺ کے مجموعی نقشہ میں اس نسبت و تناسب کی بہت اہمیت ہے کہ کس چیز کی کتنی اہمیت ہے اور کون سی چیز کس درجے میں مطلوب ہے۔ یہ چیز بھی حضورﷺ سے ثابت ہے اور یہ بھی ثابت ہے' لیکن اگر آپ نے تولے کی چیز کو سیر کر دیا یا سیر کو تولہ کر دیا تو معاملہ حقیقت کے برعکس ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر ایک نسخے کے تین اجزاء ہیں' ایک ماشہ بھر ہے' ایک تولہ بھر ہے' ایک چھٹانک بھر ہے۔ اگر آپ نے اس تناسب کو الٹا کر دیا' بایں طور کہ ماشے والے کو تولہ کر دیا اور تولے کو چھٹانک کر دیا تو اب وہ نسخہ شفاء نہیں رہے گا' بلکہ ہو سکتا ہے کہ نسخہ ہلاکت بن جائے۔

اس اعتبار سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ سنت رسولؐ اور اُسوۂ رسولؐ بحیثیت مجموعی کیا ہے اور پھر اس میں نسبت و تناسب کیا ہے۔ اول دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ آیا وہ

(۱) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب الترغیب فی النکاح۔

حضور اکرم ﷺ سے ثابت ہے؟ اس لیے کہ اگر ثابت نہیں ہے تب تو وہ بدعت ہو جائے گی۔ اور دوسری چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ جو چیزیں آپ ﷺ سے ثابت ہیں وہ کتنی ثابت ہیں‘ اس کو سامنے رکھ کر انسان فیصلہ کرے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ فرض نماز اصل اہمیت کی حامل ہے‘ لیکن ہمارے ہاں عام طور پر مذہبی حلقوں میں اور خاص طور پر جو ذرا متصوفانہ انداز کے لوگ ہوتے ہیں‘ وہ فرض کو تو بس ایسے ادا کرتے ہیں جیسے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بلکہ بعض لوگ وہ بھی ہیں جن کا سارا زور فرضوں کے بجائے نوافل پر ہے۔ وہ فرض کے معاملے میں تو کوتاہی برتتے ہیں‘ مگر رات کی نماز میں تسلسل کو ٹوٹنے نہیں دیتے۔ ہم نے بالفعل ایسے لوگ دیکھے ہیں۔ یہ تمام چیزیں درحقیقت انسان کو راہِ نبوت سے ہٹا دینے والی ہیں۔

نوافل کے بارے میں شریعت سے ثابت ہے کہ یہ لازم نہیں ہیں۔ اسی طرح رات کا قیام یعنی تہجد بھی صرف حضور ﷺ کے لیے لازم تھی‘ جبکہ دوسرے لوگوں کے لیے لازم نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ رمضان المبارک میں اس کی بہت تشویق و ترغیب دلائی گئی ہے۔ وہ خاص ایک مہینہ ہے جس میں دن کے اوقات میں کھانا پینا حرام کیا گیا ہے اور رات کو —— دو تہائی رات‘ یا کم سے کم ایک تہائی رات —— اللہ کی کتاب قرآن مجید کے ساتھ جاگنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ درحقیقت فرائض اور نوافل کے معاملے میں یہ توازن بہت ضروری ہے۔

فرائض کی اہمیت مسلّم ہے!

زیر مطالعہ حدیث میں بھی اُس شخص نے رسول اللہ ﷺ سے فرائض کی اہمیت کو جانتے ہوئے فرض نماز اور فرض روزے کا پوچھا تھا —— فرض نماز کی اہمیت کے بارے میں مجھے ایک حدیث اور یاد آئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ فِیْ جَمَاعَةٍ كَانَ كَقِيَامِ نِصْفِ لَيْلَةٍ وَمَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ وَالْفَجْرَ فِیْ جَمَاعَةٍ كَانَ كَقِيَامِ لَيْلَةٍ)) (۱)

(۱) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الصلوٰۃ‘ باب فی فضل صلاۃ الجماعۃ۔

’’جس شخص نے عشاء کی نماز باجماعت ادا کی گویا اُس نے آدھی رات قیام کیا اور جس شخص نے عشاء کی نماز بھی جماعت کے ساتھ ادا کی اور پھر فجر کی بھی تو اس کے لیے پوری رات کا قیام لکھ دیا جائے گا۔‘‘

فرض کی یہ اہمیت ہے اور نجات کے لیے بھی بنیاد (base line) فرض عبادات ہیں۔ فرائض کی ادائیگی کے بعد آدمی سے جتنا اضافہ ہو سکے‘ کرے‘ لیکن اس کے ساتھ ساتھ حالات کو بھی پیش نظر رکھے۔ اس لیے کہ بعض حالات ایسے ہوں گے جس میں اصل اہمیت جہاد و قتال کی ہو جائے گی۔ اب ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسلامی نظام‘ اسلامی حکومت اور نظامِ خلافت قائم ہے تو قتال کا معاملہ حکومت کے ذمے ہوگا اور حکومت اس کا انتظام کرے گی۔ اگر کہیں دس ہزار آدمیوں کی ضرورت ہے اور دس ہزار آدمی جانے کے لیے نکل آئے ہیں تو باقی آرام سے گھر میں سوئیں یا رات کو جاگ کر نوافل پڑھیں۔ یہ تقرب بالنوافل کا موقع ہوگا‘ لیکن اگر اللہ کا دین مغلوب ہے‘ پامال ہے‘ اسے پاؤں تلے روندا جا رہا ہے‘ شریعت کی دھجیاں بکھیری جا رہی ہیں‘ اوامر کا استہزاء ہو رہا ہے اور منکرات کی تبلیغ ہو رہی ہے تو اس صورتحال میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض ہو جائے گا۔ اگر اُس وقت لوگ اس فرض کو ترک کر کے نوافل میں لگیں گے تو یہ نوافل اُن کے منہ پر دے مارے جائیں گے۔

اس بات کو بہت زیادہ نمایاں کرنے کے لیے میں مثال دیتا ہوں۔ ذرا سوچیے‘ جب دامنِ اُحد میں معرکہ جاری تھا‘ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور حضور اکرم ﷺ کی جان پر بنی ہوئی تھی —— آپ کو معلوم ہے کہ غزوۂ اُحد میں رسول اللہ ﷺ زخمی ہوئے اور آپؐ کا اتنا خون بہہ گیا کہ آپؐ بے ہوش ہو گئے اور یہ افواہ پھیل گئی کہ آپؐ شہید ہو گئے ہیں —— اُس وقت اگر کوئی شخص مسجد نبوی میں بیٹھا ہوا درود کی تسبیح پڑھ رہا ہو‘ یا نوافل ادا کر رہا ہو‘ یا قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہو تو اس کے بارے میں حکم لگایا جائے گا کہ وہ پکا منافق ہے۔ حالانکہ کام تو وہ اچھے کر رہا ہے۔ درود پڑھنے کی بہت فضیلت احادیث میں بیان ہوئی ہے اور اسی طرح نوافل بھی تقرب الی اللہ کا بہت بڑا ذریعہ

ہیں۔ قرآن مجید کی تلاوت بھی اجر وثواب کا خزانہ ہے کہ اس کے ایک ایک حرف پر دس دس نیکیوں کا ثواب ہے اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ الٓمّٓ کو ایک حرف نہ سمجھنا' بلکہ الف علیحدہ حرف ہے' لام علیحدہ ہے اور میم علیحدہ ہے۔ اس طرح الٓمّٓ پڑھنے پر ۳۰ نیکیاں ہو گئیں۔ لیکن ہر حالت میں اور ہر وقت ایسا نہیں ہے۔ حالات کے مطابق جو چیز فرض ہو تو پہلے اس کی ادائیگی لازم ہے اور پھر نوافل کا درجہ آتا ہے۔ فرائض اور نوافل کے درجات کو ضرور ذہن میں رکھنا چاہیے' ورنہ ان نوافل کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔

حلال کو حلال سمجھنا اور حرام سے اجتناب کرنا

فرض نماز اور روزے کے بعد اُس شخص نے کہا: وَاَحْلَلْتُ الْحَلَالَ، وَحَرَّمْتُ الْحَرَامَ ''اور میں حلال ہی پر قائم رہوں اور حرام سے مجتنب رہوں''۔ گویا حلال کو حلال سمجھتے ہوئے حلال پر قائم رہنا بھی ضروری ہے' خواہ مخواہ حلال کو اپنی شدتِ تقویٰ کی وجہ سے حرام نہیں کر لینا چاہیے۔ ہمارے ایک فوت شدہ بزرگ کہا کرتے تھے کہ لوگوں کو ''تقویٰ کا ہیضہ'' ہو جاتا ہے اور وہ حلال چیزوں کو بھی چھوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ حلال کو حلال سمجھنا اور ان کا استعمال کرنا چاہیے' جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں دو مقامات پر آیا:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ۖؗ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۱۶۸﴾

''لوگو! جو چیزیں زمین میں حلال طیب ہیں وہ کھاؤ اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو۔ وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔''

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۱۷۲﴾

''اے اہلِ ایمان! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو عطا فرمائی ہیں' ان کو کھاؤ اور اگر خدا ہی کے بندے ہو تو اس (کی نعمتوں) کا شکر بھی ادا کرو۔''

سورۃ الاعراف میں فرمایا:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْۤ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِیَ

لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا خَالِصَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۳۲﴾

''(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے کہ کس نے حرام کر دی ہیں زینت (و آرائش) اور کھانے پینے کی وہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے (زمین سے) نکالی ہیں! کہہ دیجیے کہ یہ سب چیزیں دنیا میں بھی اصلاً اہلِ ایمان کے لیے ہیں (لیکن یہ کہ دنیا میں ہم کفار کو بھی دیتے ہیں جتنا چاہتے ہیں) اور قیامت کے دن تو یہ اہلِ ایمان کے لیے خالص ہو جائیں گی (پھر کفار کے لیے ان میں حصہ رہے گا ہی نہیں)۔ اسی طرح ہم اپنی آیات کی وضاحت کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔''

لہٰذا تقویٰ میں یہ بھی شامل ہے کہ جو حلال شے ہے اسے حلال سمجھو اور استعمال کرو' اور جو حرام شے ہے اسے حرام سمجھو اور اس سے اجتناب کرو۔

یہاں ایک مسئلہ یہ آ جاتا ہے' فرض کیجیے کہ کسی شخص کو بکری کا گوشت دیا گیا ہے' جبکہ اسے بتایا گیا کہ یہ سور کا گوشت ہے اور وہ اسے سور کا گوشت سمجھ کر کھا رہا ہے تو وہ سُور ہی کھا رہا ہے۔ حرام کو حرام سمجھنا ضروری ہے' اس لیے اگر تمہیں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ سُور کا گوشت ہے تو اس سے اجتناب لازم ہے۔ البتہ اگر تحقیق کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ یہ بات غلط کہی گئی ہے اور یہ تو بکری کا گوشت ہے تو پھر کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر بغیر تحقیق کے کھاؤ گے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے حرام کھا رہے ہو۔

زیرِ مطالعہ حدیث کا آخری حصہ

اس شخص نے کہا کہ اگر میں فرض نماز پڑھوں اور فرض روزے رکھوں' حلال کو حلال جانوں اور حرام کو حرام سمجھوں' وَلَمْ اَزِدْ عَلٰی ذٰلِكَ شَیْئًا ''اور میں اس پر کسی عمل کا اضافہ نہ کروں'' اَاَدْخُلُ الْجَنَّةَ؟ ''تو کیا میں جنت میں داخل ہو جاؤں گا؟'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((نَعَمْ)) ''ہاں!'' حضور اکرم ﷺ کی طرف سے ''ہاں'' سن کر اُس شخص نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا: وَاللّٰهِ لَا اَزِیْدُ عَلٰی ذٰلِكَ شَیْئًا ''اللہ کی قسم! میں اس پر کسی چیز کا اضافہ نہیں کروں گا۔''

اس حدیث سے اب یہ مطلب نکالنا کہ یہاں چونکہ زکوٰۃ اور حج کا ذکر نہیں ہے' لہٰذا زکوٰۃ اور حج لازم نہیں' غلط ہے۔ اسی طرح چونکہ یہاں ایمان کا ذکر نہیں' لہٰذا یہ کہنا کہ اگر کوئی شخص نیک اعمال کر رہا ہے' چاہے اس کے دل میں ایمان ہے یا نہ ہے وہ بہرحال جنت میں جائے گا' ایسے نتیجے اخذ کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ سارے غلط نتائج ہیں جو صرف اس لیے ذہن میں آتے ہیں کہ انسان حدیث کے پس منظر اور مخاطب کو پیش نظر نہیں رکھتا۔ زیر مطالعہ حدیث ایک معین شخص کے احوال پر مبنی ہے (گویا ایک پی پی کال ہے) اور نبی اکرم ﷺ نے اس کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اُسے صرف نماز' روزہ اور حلال وحرام کی تمیز پر جنت کا پروانہ تھما دیا ہے' لہٰذا حدیث کے پس منظر اور باقی حالات وواقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کو سمجھنا چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہاں اصل مضمون فرض اور نفل کا ہے۔ نماز فرض ہے پڑھو' روزہ فرض ہے رکھو' زکوٰۃ فرض ہے تو ادا کرو' حج فرض ہے تو اس کے لیے ضرور جاؤ۔ اس لیے کہ استطاعت کے ہوتے ہوئے بھی حج نہ کرنے کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٧﴾﴾ (آلِ عمران) ''اور لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا حق (یعنی فرض) ہے کہ جو اس گھر تک جانے کا مقدور رکھے وہ اس کا حج کرے' اور جو اس حکم کی تعمیل نہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اہلِ عالَم سے بے نیاز ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کی جامع نصیحتیں

اب آیئے اگلی حدیث کی طرف۔ دراصل حدیث ۲۳ جوامع الکلم کا گلدستہ ہے اور اس کے ہر جملے میں معانی کا اک جہاں پنہاں ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ حضور ﷺ کا اپنا فرمان ہے: ((اُوْتِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ)) (۱) ''مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة' باب قول النبی بعثت بجوامع الکلم۔ وصحیح مسلم' کتاب المساجد ومواضع الصلاة۔

جامع کلمات عطا ہوئے ہیں''۔ جوامع الکلم سے مراد ہے دو' تین الفاظ میں بہت بڑی اور بہت ساری حقیقتوں کو سمو دینا۔ یہ حضور ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک خاص عطیہ ہے۔ قرآن بھی جوامع الکلم ہے' مثلاً سورۃ العصر میں پورا قرآن مجید موجود ہے۔ سورۃ العصر کی صرف تین آیات ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ علیہ اس کے بارے میں کہتے ہیں: لَوْ تَدَبَّرَ النَّاسُ هٰذِهِ السُّوْرَةَ لَوَسِعَتْهُمْ ''اگر لوگ صرف اس ایک سورت پر غور وفکر کریں (اور اس کی گہرائی میں جائیں) تو یہ ان کی ہدایت کے لیے کافی ہو جائے گی''۔ مفتی محمد عبدہٗ نے آخری پارہ کی جو تفسیر لکھی ہے اس میں امام شافعی کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: لَوْ لَمْ يُنَزَّلْ مِنَ الْقُرْآنِ سِوَاهَا لَكَفَتِ النَّاسَ ''اگر قرآن مجید میں سوائے اس (ایک سورۃ یعنی سورۃ العصر) کے اور کچھ نازل نہ ہوتا تو لوگوں کی ہدایت کے لیے یہی کافی تھا''۔ سورۃ العصر کی اسی اہمیت کے پیش نظر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس سورۂ مبارکہ کے ساتھ بہت قلبی اُنس تھا۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں حضرت ابومزینہ دارمی رضی اللہ عنہ کی یہ روایت طبرانی کی ''معجم الاوسط'' میں اور امام بیہقی کی ''شعب الایمان'' میں منقول ہے کہ:

> كَانَ الرَّجُلَانِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ اِذَا الْتَقَيَا لَمْ يَتَفَرَّقَا حَتّٰى يَقْرَأَ اَحَدُهُمَا عَلَى الْآخَرِ سُوْرَةَ الْعَصْرِ ثُمَّ يُسَلِّمُ اَحَدُهُمَا عَلَى الْآخَرِ
>
> ''نبی اکرم ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم میں سے کوئی سے دو صحابہؓ جب بھی باہم ملاقات کرتے تھے تو وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے جب تک کہ ایک دوسرے کو سورۃ العصر سنا نہ لیں' اس کے بعد وہ ایک دوسرے کو سلام کر کے رخصت ہو جاتے۔''

سورۃ العصر پھیلتی ہے' پھولتی ہے اور اس کے مضامین سے اس کی شاخیں بنتی ہیں۔ ﴿وَالْعَصْرِ﴾ میں زمانہ' تاریخ' تاریخی حالات وواقعات' انباء الرسل اور قصص النّبیین آ رہے ہیں۔ ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ میں ایمان کے مباحث آ رہے ہیں۔ ﴿وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ میں اعمالِ صالحہ کی تشریح آ رہی ہے۔ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ میں اعمالِ صالحہ کے مدارج کا بیان ہے۔ گویا یہ سورۃ پورے قرآن کے مضامین کا انڈیکس ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سورۃ العصر ایک ایسے بیج کی مانند ہے جس میں قرآن مجید کا پورا

شجرۂ طیّبہ موجود ہے۔

اسی طرح حضور اکرم ﷺ کی احادیث بھی جوامع الکلم ہیں۔ ہم یہ حدیث بھی پڑھ چکے ہیں: ((اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ))۔ اب یہ دو لفظ ہیں‘ لیکن ان دو لفظوں میں گویا ہدایت کا ایک سمندر کوزے کے اندر بند کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح زیر مطالعہ حدیث بھی جوامع الکلم میں سے ایک ہے اور اس کی خاصیت یہ ہے کہ اس حدیث کے ہر ہر جملہ میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے ہدایت کا وافر ذخیرہ موجود ہے —— اب اس حدیث کا جملہ وار مطالعہ کرتے ہیں:

پاکیزگی نصف ایمان ہے!

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَلطُّھُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ)) ’’پاکی نصف ایمان ہے‘‘۔ پاکی نصف ایمان کیوں ہے؟ اس کے بارے میں نوٹ کر لیں کہ اس عالَم کے اندر نیکی کے داعی اور نیکی کی طرف لوگوں کو بلانے والے بھی موجود ہیں اور خود اپنی ذات میں نیکی کے نمونے بھی موجود ہیں۔ یعنی فرشتے اور داعیانِ دین۔ اور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہم پڑھ چکے ہیں کہ اولیاء اللہ کی ارواح کو بھی ان کے انتقال کے بعد اللہ تعالیٰ فرشتوں کے طبقہ اسفل میں شامل کر دیتے ہیں۔ اب فرشتوں کے ساتھ روحانی طور پر قرب حاصل کرنے کے لیے پاکی شرط ہے‘ اس لیے کہ وہ ناپاکی کے قریب نہیں آتے۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِکَۃُ بَیْتًا فِیْہِ کَلْبٌ وَلَا صُوْرَۃُ تَمَاثِیْلَ)) (۱)

’’جس گھر میں کُتّا ہو یا تصاویر ہوں تو اس گھر میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔‘‘

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان چیزوں سے نیکی کو اور اس لطافت کو مناسبت نہیں ہے۔ اور اگر آپ اس طرح کا معاملہ کر رہے ہیں تو گویا فرشتوں کے قرب سے‘ ان کے لمس سے اور ان کے فیض سے آپ محروم رہ گئے۔ لیکن اگر آپ پاک رہیں گے تو یہ سب حاصل ہوگا۔ لہٰذا پاکیزگی ہر حال میں ہونی چاہیے‘ جیسے کہ حضور ﷺ کا معمول تھا کہ رات کو سونے سے

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب بدء الوحی‘ باب ذکر الملائکۃ۔ وصحیح مسلم‘ کتاب اللباس والزینۃ‘ باب تحریم تصویر صورۃ الحیوان......

پہلے وضو فرماتے تھے‘ تاکہ سوتے ہوئے انسان پاکی کی حالت میں رہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جو اچھے خواب ہوتے ہیں وہ فرشتوں کی طرف سے ہوتے ہیں اور جو برے خواب ہوتے ہیں وہ شیطان یا اپنے نفس کی طرف سے ہوتے ہیں۔ لہٰذا نیک لوگوں اور فرشتوں کے قرب کے لیے پاکیزگی بے حد ضروری ہے۔

سبحان اللہ اور الحمد للہ کی فضیلت

آگے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَاُ الْمِیْزَانَ)) ’’اور الحمد للہ سے میزان پُر ہو جاتی ہے‘‘۔ میزان سے مراد ’’میزانِ عمل‘‘ ہے یعنی جو اللہ کے ہاں انسان کے اعمال کو تولنے کے لیے ترازو ہے اس ترازو کے پلڑے کو الحمد للہ کا چھوٹا سا کلمہ بھر دے گا۔ ایک حدیث میں آتا ہے: ((اَلتَّسْبِیْحُ نِصْفُ الْمِیْزَانِ‘ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ یَمْلَؤُہٗ)) (۱) ’’سبحان اللہ کہنا نصف میزان ہے اور الحمد للہ اس کو بھر دیتا ہے‘‘۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے دو پہلو ہیں۔ ایک ہے ’’سُبْحَانَ اللّٰہِ‘‘ —— یعنی یہ یقین رکھنا کہ اللہ کے علم میں‘ اُس کی قدرت میں‘ اُس کی صفات میں‘ اُس کے کمالات میں کہیں کوئی کمی نہیں ہے‘ کوئی نقص اور کسی عیب کا کیا سوال! یہ ہے سبحان اللہ کا مفہوم۔ اگر واقعتاً یہ قلب کی گہرائیوں سے نکل رہا ہے تو اس کی تاثیر اس حدیث میں بتا دی گئی کہ یہ نصف میزان ہے۔ جبکہ اللہ کی معرفت کا دوسرا پہلو ہے: ’’اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ‘‘ —— یعنی اللہ کی نعمتوں پر اُس کا شکر بجا لانا۔ اللہ نے جو جو نعمتیں ہمیں دی ہیں ان کا ذکر بھی کرنا ہے اور اس پر اللہ کا شکر بھی ادا کرنا ہے۔ جیسے سورۃ الضُّحیٰ میں فرمایا: ﴿وَاَمَّا بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ ﴿۱۱﴾﴾ ’’اور (لوگوں سے) اپنے رب کی نعمتوں کا تذکرہ بھی کرتے رہا کریں (کہ یہ بھی شکر گزاری کا ایک طریقہ ہے)۔‘‘

اس ضمن میں یہ بھی یاد رہے کہ قرآن مجید اللہ ربّ العزت کی بنی نوعِ انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے۔ سورۃ الکہف کے آغاز میں فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا ﴿۱﴾﴾ ’’کُل حمد و ثنا اور کُل شکر اللہ ہی

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب الدعوات‘ باب منہ۔ ومسند احمد‘ ح:۲۱۹۹۵۔

کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی‘‘۔ اسی طرح سورۃ الفرقان کے آغاز میں فرمایا:﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۙ﴾ ’’بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر الفرقان اُتارا تاکہ وہ تمام جہان والوں کو خبردار کرنے والا بن جائے‘‘۔ لہٰذا قرآن مجید کی اس عظیم نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرنا ہم سب پر لازم ہے۔

آگے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَاٰنِ مَا بَيْنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)) ’’اور سبحان اللہ اور الحمدللہ (جب جمع ہو جائیں گے تو) وہ زمین اور آسمان کے درمیانی خلا کو بھر دیں گے‘‘۔ یہ ان دو کلمات کی عظمت کے بیان کا ایک اسلوب ہے۔ اس کو ہم مادی اعتبار سے نہیں سمجھ سکتے کہ اس سے مراد کیا ہے۔ صحیح بخاری کی آخری حدیث بھی ان کلمات کی عظمت کے بیان میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ، ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ، خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ :سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ))

’’دو کلمات ہیں جو رحمان کو بہت پسند ہیں‘ میزان میں بہت بھاری ہیں اور زبان پر بہت ہلکے ہیں۔ وہ ہیں: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ‘‘۔

نماز نور ہے

’’سُبْحَانَ اللّٰهِ‘‘ اور ’’اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ‘‘ کی عظمت کو بیان کرنے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَالصَّلَاةُ نُوْرٌ)) ’’اور نماز نور ہے‘‘۔ نماز انسان کے اندر برائی سے رکنے اور اچھائی کے کام کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے بشرطیکہ وہ حقیقت میں نماز ہو۔ وہ نماز جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے: ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ﴾ (العنکبوت: ۴۵) ’’یقیناً نماز فحش کاموں اور منکر سے روکنے والی ہے‘‘۔ اور اگر صرف ایک جسمانی ورزش (physical exercise) ہو رہی ہے‘ اس کا کوئی حق ادا نہیں کیا گیا‘ خشوع وخضوع کی کیفیت حاصل ہی نہیں ہوئی‘ حضورِ قلب کا معاملہ ہوا ہی نہیں‘ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مناجات کی کیفیت پیدا ہی نہیں ہوئی تو پھر ٹھیک ہے کہ فرض

ادا ہو گیا۔ باقی اس کے اندر برائی ومنکر سے روکنے کی تاثیر نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح نماز انسان کے اندر باطنی بصیرت پیدا کرتی ہے۔ یہ وہ نور ہے جس سے اسے نظر آنے لگتا ہے کہ یہ حق ہے اور یہ باطل ہے‘ یہ صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔ یہ اصل میں انسان کی وہ بصیرت ہے جو اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے اور نماز اس کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

صدقہ دلیل ہے

رسول اللہ ﷺ نے مزید فرمایا: ((وَالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ)) ’’اور صدقہ دلیل ہے‘‘۔ یعنی صدقہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ شخص واقعی صادق الایمان ہے۔ ’’آیت البر‘‘ میں آپ نے دیکھا کہ انفاق فی سبیل اللہ کے بعد کس قدر شدومد کے ساتھ آیا ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ١٧٧﴾۔ فرمایا:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَـتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّاۗىِٕلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰھَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ

’’نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو بلکہ نیکی تو اُس کی ہے جو ایمان لائے اللہ پر‘ یومِ آخرت پر‘ فرشتوں پر‘ کتاب پر اور نبیوں پر۔ اور وہ خرچ کرے مال اس کی محبت کے باوجود قرابت داروں‘ یتیموں‘ محتاجوں‘ مسافروں اور مانگنے والوں پر اور گردنوں کے چھڑانے میں۔ اور قائم کرے نماز اور ادا کرے زکوٰۃ۔ اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے عہد کو جب کوئی عہد کرلیں۔ اور خاص طور پر صبر کرنے والے فقر وفاقہ میں‘ تکالیف میں اور جنگ کی حالت میں۔ یہ ہیں وہ لوگ جو سچے ہیں۔ اور یہی حقیقت میں متقی ہیں۔‘‘

درحقیقت جب انسان اپنا مال صدقہ کے طور پر نکال کر دیتا ہے تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ایمان ہے۔ تبھی تو وہ دے رہا ہے‘ ورنہ کاہے کو دیتا ہے کوئی

شخص؟ ظاہر بات ہے ہر شخص اپنے مال سے نفع چاہتا ہے۔ اب ایک مادی نفع ہے جو آپ کو اس دنیا میں حاصل ہوتا ہے اور ایک نفع وہ ہے جو آخرت میں حاصل ہوگا اور یہ سب سے بڑا نفع ہے۔ لہٰذا جو شخص کسی مادی منفعت کے حصول کے لیے نہیں، صرف اللہ کی رضاجوئی کے مال دیتا ہے، صدقہ کرتا ہے یہ گویا اس کے ایمان کا ثبوت ہے۔

صبر روشنی ہے

زیر مطالعہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے جملوں کی ترتیب دیکھیے۔ سب سے پہلے پاکیزگی کا بیان، پھر ذکر الٰہی کا، پھر نماز اور صدقہ کا اور اب صبر کا تذکرہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَالصَّبْرُ ضِيَاءٌ)) ''اور صبر ایک روشنی ہے''۔ جیسے روشنی میں آپ کو راستہ صحیح نظر آتا ہے، اسی طرح آپ میں اگر صبر کا مادہ ہے تو راستہ آپ کے لیے کھلتا چلا جائے گا۔ قرآن مجید میں یہ الفاظ کئی مقامات پر آئے ہیں: ﴿وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ ''اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔ —— صبر کے بارے میں بارہا گفتگو ہو چکی ہے۔ ایک صبر ہے: صبر عن المعصية یعنی معصیت سے اپنے آپ کو روکنا۔ ایک ہے: صبر على الطاعة یعنی اطاعت پر جمے رہنا۔ ہوسکتا ہے کسی وقت انتہائی سرد موسم میں آپ کو غسل کی حاجت ہوگئی اور گرم پانی کا آپ کے پاس کوئی اہتمام نہیں ہے تو اُس وقت ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا اور اس کو برداشت کرنا یہ صبر علی الطاعۃ ہے۔ اسی طرح ایک ہے: صبر على الابتلاء یعنی اللہ کی طرف سے جو آزمائش یا مصیبت آجائے اس پر صبر کرنا، اس کو جھیلنا، اس کو برداشت کرنا۔ اسی طریقے سے جہاد اور قتال کے اندر صبر کا معاملہ ہے۔ صبر کی اقسام کے حوالے سے آیت البر میں یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿......وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿١٧٧﴾﴾

''......اور خاص طور پر صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں، تکالیف میں اور جنگ کی حالت میں۔ یہ ہیں وہ لوگ جو سچے ہیں۔ اور یہی حقیقت میں متقی ہیں۔''

قرآن حجت ہے!

آگے زیر مطالعہ حدیث کا اہم ترین حصہ آ رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((وَالْقُرْاٰنُ حُجَّةٌ لَكَ اَوْ عَلَيْكَ)) ''اور قرآن تمہارے حق میں دلیل ہے یا تمہارے خلاف دلیل بنے گا''۔ قرآن کی ہدایت سے استفادہ کرو گے تو یہ دنیا میں تمہارے لیے دلیل ہے اور آخرت میں تمہارے لیے شافع بن کر کھڑا ہو جائے گا۔ جیسے کہ ایک حدیث میں روزے اور قرآن کے حوالے سے آتا ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلصِّيَامُ وَالْقُرْآنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ ، يَقُوْلُ الصِّيَامُ : اَىْ رَبِّ اِنِّىْ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِىْ فِيْهِ ، وَيَقُوْلُ الْقُرْآنُ : مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنِىْ فِيْهِ ، فَيُشَفَّعَانِ)) (۱)

''روزہ اور قرآن (قیامت کے روز) بندے کے حق میں شفاعت کریں گے۔ روزہ عرض کرے گا: اے ربّ! میں نے اس شخص کو دن میں کھانے پینے اور خواہشاتِ نفس سے روکے رکھا، تو اُس کے حق میں میری سفارش قبول فرما! اور قرآن یہ کہے گا کہ اے پروردگار! میں نے اسے رات کے وقت سونے سے روکے رکھا، لہٰذا اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما! چنانچہ (روزہ اور قرآن) دونوں کی شفاعت (بندے کے حق میں) قبول کی جائے گی۔''

اس لحاظ سے قرآن مجید دنیا میں بھی حجت ہے، بایں طور کہ صحیح اور سیدھے راستے کی طرف آپ کی رہنمائی کرتا ہے اور قیامت میں بھی آپ کے حق میں شافع بن کر کھڑا ہوگا۔ اس کے برعکس اگر قرآن کو آپ نے رد کر دیا، اس کے احکام کو آپ نے توڑ دیا یا قرآن کی ہدایت کو قبول کرنے سے اعراض کیا تو اس صورت میں یہ آپ کے خلاف گواہ بن کر کھڑا ہوگا اور کہے گا: اے اللہ! یہ کہتا تو تھا کہ مجھ (قرآن) پر ایمان رکھتا ہے، حالانکہ حقیقی معنوں میں اس کا مجھ پر ایمان نہیں تھا۔ یہ مجھے پڑھتا ہی نہیں تھا اور نہ اس نے کبھی مجھے سمجھنے کی کوشش کی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس قرآن کو ہمارے حق میں حجت بنا دے، اسے ہمارا امام و راہنما بنا دے اور اسے ہمارے حق میں رحمت بنا دے۔ آمین یا ربّ العالمین!

(۱) رواه البيهقى فى شعب الايمان و مسند احمد ، ح: ٦٣٣٧۔

انسان اور مشقت: لازم وملزوم

زیر مطالعہ حدیث کا آخری ٹکڑا بڑا حکیمانہ ہے۔ فرمایا: ((کُلُّ النَّاسِ یَغْدُوْ، فَبَائِعٌ نَفْسَہٗ)) ''سب لوگ صبح کرتے ہیں اور پھر وہ (دن بھر) اپنی جان کو بیچتے ہیں''۔ جان کو بیچنا کیا ہے' اس کو سمجھ لیجیے۔ ایک مزدور' مزدوری کر رہا ہے تو وہ اپنی توانائی کو' اپنی قوت کو استعمال کر رہا ہے' گویا وہ اپنے آپ کو بیچ رہا ہے۔ اسی طرح ایک ڈاکٹر اپنا علم بیچ رہا ہے' بایں طور کہ وہ اپنے کلینک پر بیٹھا مریض کو دیکھتا ہے' نسخہ لکھ کے دیتا ہے اور پھر اپنی فیس لیتا ہے۔ گویا یہ بھی اپنے آپ کو بیچ رہا ہے۔ اسی طرح وکیل اپنے دماغ کو بیچتا ہے' عدالت میں جا کر دلائل دیتا ہے اور اس کے پیسے لیتا ہے۔ الغرض ہر شخص اپنے آپ کو بیچ رہا ہے۔ کوئی بھی شخص اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر شخص صبح کرتا ہے تو اس کے بعد وہ دن بھر اپنے آپ کو بیچتا رہتا ہے۔ اپنی توانائیاں' اپنی قوتیں' اپنی صلاحیتیں ـــ جو اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر رکھی ہوئی ہیں ـــ ان سب کو بروئے کار لاتا ہے' لیکن نتیجہ کیا نکلتا ہے؟

اس نتیجہ کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَمُعْتِقُھَا اَوْ مُوْبِقُھَا)) ''پس وہ اپنے نفس کو جہنم کی آگ سے بچا کر لے آتا ہے یا خود کو تباہ و برباد کر بیٹھتا ہے''۔ یعنی اگر اُس نے کوئی حرام کام نہیں کیا' کوئی غلط کام نہیں کیا' جھوٹ نہیں بولا' خیانت نہیں کی تو وہ اپنے آپ کو بچا لیتا ہے۔ اس نے مزدوری کا معاملہ طے کیا تھا کہ میں شام تک یہ محنت کروں گا اور سو روپے لوں گا تو پھر اُس نے کوئی وقت ضائع نہیں کیا۔ اُس نے یہ نہیں کیا کہ اب مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا تو میں آرام کر لوں' کیونکہ یہ خیانت ہے' اس لیے کہ اسے اس وقت محنت کرنی چاہیے۔ اسی طرح اگر آپ سرکاری ملازم ہیں' آپ کو تنخواہ ملتی ہیں' آپ کے لیے مختلف سہولتیں اور مراعات ہیں' لیکن اگر آپ آفس جا کر خوش گپیاں کریں' چائے پئیں اور دوستوں کو entertain کریں' جبکہ دوسری طرف سائلین پریشان ہو رہے ہوں' ان کے کام نہ ہو رہے ہوں' فائلوں کے انبار میز پر لگ رہے ہوں تو یہ خیانت ہے' اس لیے کہ آپ نے اپنے فرائض ادا نہیں کیے۔ اس اعتبار سے گویا مشقت تو جھیلی ہے' محنت تو کی

ہے لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آپ نے اپنے نفس کو جہنم میں ڈال دیا ہے۔ مشقت اور محنت اپنی جگہ' لیکن آپ اگر ایسا کر رہے ہیں تو آپ شام کو گناہوں کی گٹھڑی لے کر واپس آ رہے ہیں۔ جبکہ اس مشقت اور محنت کے حوالے سے قرآن مجید میں قسمیں کھا کر کہا گیا ہے: ﴿لَآ اُقْسِمُ بِھٰذَا الْبَلَدِ ① وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِھٰذَا الْبَلَدِ ② وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ③ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ ④﴾ ''نہیں' مجھے قسم ہے اس شہر (مکہ) کی' جس میں (اے نبی ﷺ!) آپ کو حلال کر لیا گیا ہے۔ اور مجھے قسم ہے باپ (یعنی آدم) اور اُس کی اولاد کی' کہ ہم نے انسان کو مشقت (کی حالت) میں (رہنے والا) پیدا کیا''۔

مشقت ہر انسان کا مقدّر ہے

یہ مشقت اور محنت ہر انسان کا مقدّر ہے' صرف نوعیت کا فرق ہے۔ بعض لوگوں کی جسمانی مشقت زیادہ ہے اور بعض لوگوں کی ذہنی مشقت زیادہ ہے۔ بعض لوگوں کو روٹی کی پریشانی ہوتی ہے' جبکہ بعض لوگوں کو اپنے نقصان کی پریشانی ہوتی ہے۔ کروڑ پتی ہیں لیکن نقصان آ گیا تو اب پریشانی ہے' ایک رنج اور غم ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ دولت مندوں میں جس قدر دماغی امراض ہوتے ہیں وہ مزدوروں میں نہیں ہوتے۔ مزدور تو صبح سے شام تک محنت کر کے تھکے ہارے لیٹتے ہی سو جاتے ہیں اور پھر صبح ہی آنکھ کھلتی ہے۔ لیکن دولت مند لوگوں کو نیند کے لیے سکون آور دوائیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور انہیں ان کے بغیر نیند نہیں آتی۔

انسانی مشقت کے حوالے سے سورۃ الانشقاق میں فرمایا گیا: ﴿یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ ⑥﴾ (الانشقاق) ''اے انسان! تو مشقت پر مشقت جھیلتے ہوئے آئے گا اور اپنے رب سے ملاقات کرے گا''۔ یعنی ایک کافر یا فاسق و فاجر شخص دنیا میں بھی مشقت جھیلتا ہے اور آخرت میں بھی ناکامی و بربادی سے دوچار ہوگا' جبکہ ایک بندۂ مؤمن جس نے دنیا میں مشقتیں اور مصیبتیں جھیلی ہیں اور اس پر صبر کیا ہے' اسی طرح اللہ کے دین کے لیے مشقت کی ہے' ایثار کیا ہے' بھاگ دوڑ کی ہے' اللہ کے دین کی دعوت اور اس کی اقامت کی جِدوجُہد میں اپنی صلاحیتیں گھلائی ہیں تو ایسے

شخص کے لیے آخرت میں سکون و راحت ہوگی۔ سورۃ الواقعہ میں ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿٨٩﴾﴾ ''پس اس کے لیے آرام و آرائش اور خوشبودار پھول اور نعمت کے باغ ہیں''۔ ان کے لیے وہاں کوئی مشقت نہیں ہے' وہاں تو بس آرام اور راحت ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر شخص کا مقدر ہے کہ وہ محنت کرتا ہے' مشقت کرتا ہے' تکلیفیں جھیلتا ہے' حتیٰ کہ آپ یوں سمجھئے کہ حیوانات کے مقابلے میں ایک اعتبار سے انسان کا معاملہ زیادہ خراب ہے۔ اس لیے کہ حیوانات میں وہ احساسات نہیں ہوتے جو انسان میں ہوتے ہیں۔ اگر آپ کا جوان بیٹا آپ کے سامنے سینہ تان کر کہے: چھوڑیں' ابا جان! آپ تو دقیانوسی قسم کی باتیں کرتے ہیں اور میں آپ کی ان باتوں کو نہیں مانتا تو اس پر جو رنج و غم آپ کو ہوگا وہ کسی بیل گائے یا کسی اور حیوان کو کبھی نہیں ہوسکتا' اس لیے کہ وہ ان احساسات سے عاری ہیں۔ اسی طرح آپ کو معلوم ہے کہ سب سے زیادہ لاچار انسانی بچہ ہوتا ہے۔ بکری کا بچہ پیدائش کے فوراً بعد کھڑا ہونا شروع کر دیتا ہے۔ کچھ دیر اس کی ٹانگیں لڑکھڑاتی ہیں اور اس کے بعد وہ صحیح طور سے کھڑا ہو جاتا ہے۔ جبکہ انسان کے بچے کو کس قدر نگہداشت (care) اور محنت و مشقت کی ضرورت ہوتی ہے' کس قدر اس کے لیے راتوں کو اپنی نیندیں حرام کرنی پڑتی ہیں' کس طرح اس کے لیے پیٹ کاٹ کر سارا بندوبست کرنا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے انسان لدو اونٹ کی طرح ہے۔

تقسیمِ دولت کا غلط نظام: دو دھاری تلوار

خاص طور پر جب کسی معاشرے میں تقسیم دولت کا نظام غلط ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ایک طرف دولت کے انبار لگ جائیں گے اور دوسری طرف بھوک' احتیاج اور فاقہ ہوگا۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے کہا ہے کہ تقسیم دولت کا یہ غلط نظام دو دھاری تلوار ہے' جو اِدھر بھی کاٹتی ہے' اُدھر بھی کاٹتی ہے۔ ادھر دولت جمع ہوگئی ہے تو عیاشیاں ہوں گی' بدمعاشیاں ہوں گی' اللّے تللّے ہوں گے۔ وہ بھی گویا انسان اپنی جان کو ہلاک کر رہا ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا: ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ

الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿٢٧﴾﴾ (بنی اسرائیل) ''یہ بے جا خرچ کرنے والے تو شیطانوں کے بھائی ہیں' اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے''۔ یہ فضول خرچ اس لیے بن گئے ہیں کہ ان کے پاس دولت جمع ہوگئی ہے اور دولت اپنا ظہور چاہتی ہے۔ دولت والے دنیا پر اپنا رعب گانٹھنا چاہتے ہیں کہ ہماری دولت اور اس کے مظاہر دیکھو۔

دوسری طرف فقر و فاقہ ہے اور فقر کے حوالے سے یہ حدیث بھی پیش نظر رہنی چاہیے: ((كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَكُوْنَ كُفْرًا)) (۱) ''فقر انسان کو کفر کے قریب لے جاتا ہے''۔ جب انسان کفر کے قریب آ گیا تو اب وہ ناشکرا بن کر اللہ سے شکایت کرے گا یا وہ حرام میں منہ مارے گا یا خودکشی کر کے حرام موت مر جائے گا۔ اس لحاظ سے دولت کی تقسیم کا غلط نظام واقعتاً دو دھاری تلوار ہے۔ لیکن ایک شخص فقر و فاقہ کے باوجود محنت کر کے حلال ذرائع سے اپنے بچوں کے لیے دو وقت کی روٹی کا اہتمام کر رہا ہے تو ایسے شخص کو اللہ کا دوست کہا گیا ہے۔ ایک حدیث بھی بیان کی جاتی ہے: ((اَلْكَاسِبُ حَبِيْبُ اللّٰهِ)) (۲) ''اکلِ حلال کے لیے محنت و مشقت کرنے والا اللہ کا دوست ہے''۔ دیکھئے لفظ ''حَبِیب'' فعیل کے وزن پر ہے اور یہ فاعل اور مفعول دونوں کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ حَبِیب کا معنی اللہ سے محبت کرنے والا بھی ہے اور اللہ کا محبوب بھی۔ حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ)) (۳)

''امانت دار سچا تاجر (قیامت کے دن) انبیاء' صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا''۔

اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنَا حِسَابًا يَّسِيْرًا

اس ضمن میں ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ دنیا کی یہ محنت اور مشقت جھیل کر انسان آخرت کی کامیابیاں سمیٹتا ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا: ﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ﴿٧﴾

(۱) مشكاة المصابيح' كتاب الآداب' ح: ٥٠٥١ ـ وضعيف الجامع الصغير' ح: ٤١٤٨' راوی: انس بن مالکؓ۔

(۲) یہ حدیث دستیاب ذخیرۂ حدیث میں نہیں مل سکی۔ (مدیر)

(۳) سنن الترمذی' ابواب البیوع' باب ما جاء فی التجار وتسمیة النبی ایاھم۔

فَسَوۡفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیۡرًا ⑧ وَّ یَنۡقَلِبُ اِلٰۤی اَہۡلِہٖ مَسۡرُوۡرًا ⑨﴾ (الانشقاق)

''تو جس کا اعمال نامہ اُس کے داہنے ہاتھ میں دے دیا گیا تو اس کا حساب بہت آسان لیا جائے گا اور وہ اپنے گھر والوں میں خوش خوش لوٹ کر آئے گا''۔ آسان حساب کے بارے میں حدیث میں بتایا گیا ہے کہ کسی تفصیل میں جائے بغیر بس صرف سرسری دیکھ لینا ہے اور اس کے برعکس جس سے تفصیلی حساب لے لیا گیا گویا وہ ہلاک ہو گیا۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ حَاسِبْنِیْ حِسَابًا یَسِیْرًا))[1] ''اے اللہ! مجھ سے حساب لینا آسان حساب!'' ہمیں بھی اس دعا کا اہتمام کرنا چاہیے اور خاص طور پر قرآن مجید کی وہ سورتیں جن کا اختتام حساب کتاب پر ہوتا ہے' ان کو پڑھ کر یہ دعا ضرور مانگنی چاہیے۔ مثلاً سورۃ الزلزال کے آخر میں حساب کتاب کا ذکر ہے' وہاں فرمایا:

﴿فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ ⑦ وَ مَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ⑧﴾

''تو جس نے ذرّہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرّہ بھر برائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔''

اسی طرح سورۃ التکاثر کے آخر میں ہے: ﴿ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ یَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِیۡمِ ⑧﴾ ''اُس دن تم سے نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا''۔ تو ایسے مقامات کی تلاوت کے بعد کہنا چاہیے: اَللّٰھُمَّ حَاسِبْنَا حِسَابًا یَسِیْرًا!!

فقر و فاقہ میں ملنے والے کھانے کا بھی حساب ہوگا

ایک حدیث میں یہ حساب کا معاملہ بڑے عجیب طریقے سے مذکور ہے۔ اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے گھر کئی وقت کا فاقہ تھا۔ وہ گھر سے نکل کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی حال تھا کہ آپؐ خود بھی کئی دنوں کے فاقے سے تھے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہچان لیا کہ عمر اس وقت فاقے

(۱) رواہ احمد۔ مشکاۃ المصابیح' کتاب احوال القیامۃ وبدء الخلق' باب الحساب والقصاص والمیزان۔

اور بھوک کی حالت میں ہیں اور میرے پاس اس لیے آئے ہیں کہ شاید یہاں کھانے کے لیے کچھ ہو۔ تھوڑی دیر میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی آ گئے اور ان کا بھی یہی حال تھا۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم شاید اپنے لیے تو کچھ نہ کرتے' لیکن آپؐ اپنے ان دونوں ساتھیوں کو لے کر ایک انصاری صحابی ابو الھیثم بن تیھان رضی اللہ عنہ کے باغ میں پہنچے۔ ان کی تو گویا عید ہو گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آ گئے اور ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) بھی۔ وہ دوڑ کر کچھ کھجوریں لے آئے —— جسے عربی میں ''نُزُل'' کہتے ہیں' یعنی مہمان جیسے ہی آئے تو ابتدائی مہمان نوازی کے طور پر فوری طور پر کچھ پیش کرنا۔ جیسے ہم مہمان کے آتے ہی اس سے پوچھتے ہیں کہ ٹھنڈا چلے گا یا گرم؟ اور پھر فوری طور پر وہ پیش کر دیتے ہیں —— اس کے بعد انصاری صحابیؓ نے چھری اُٹھائی تاکہ کسی جانور کو ذبح کریں اور گوشت پکائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی دودھ والے جانور کو ذبح نہ کرنا۔ انہوں نے ایک جانور ذبح کیا اور اس کا گوشت بھون کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان دو اصحاب کے سامنے رکھا تو انہوں نے وہ تناول فرمایا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روٹی کے اوپر کچھ بوٹیاں رکھ کر کہا: جاؤ عائشہ کو دے آؤ' اسے بھی کئی وقت کا فاقہ ہے۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ھٰذَا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ مِنَ النَّعِیْمِ الَّذِیْ تُسْاَلُوْنَ عَنْہُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ))[1]

''قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے' یاد رکھو کہ یہ وہ نعمتیں ہیں جن کے بارے میں تم سے قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔''

دیکھئے' اس فقر و فاقے اور احتیاج میں یہ چند چیزیں ملی ہیں تو ان کا حساب بھی ہوگا۔

اللہ تعالیٰ یومِ حشر کے حساب کو ہمارے لیے آسان کر دے اور ہمیں دنیا میں حق کے لیے' خیر کے لیے' اللہ کے دین کے لیے مشقت کرنے کی توفیق عطا فرمائے' آمین یاربّ العالمین!

اقولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

(مرتب: حافظ محمد زاہد' ادارتی معاون' شعبہ مطبوعات)

(۱) سنن الترمذی' ابواب الزھد' باب ماجاء فی معیشۃ اصحاب النبی۔

درس ۹

جماعتی زندگی کے مہلک ترین مرض

نجویٰ

کی حقیقت اور اللہ کی جانب سے اس کی شدید مذمت

انجینئر حافظ نوید احمد☆

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ   بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى
ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ
اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ
شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۷ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ
وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ۡ وَاِذَا جَاۗءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا
لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ۙ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ۭ حَسْبُهُمْ
جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۸ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا
تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۭ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۹ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَاۗرِّهِمْ شَيْـــًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا
يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ

☆ مرکزی ناظم تعلیم وتربیت، تنظیم اسلامی naveed.ahmad@quranacademy.com

وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۱ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا
اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ
وَاَطْهَرُ ۭ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۲ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ
يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۭ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ
وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۳ (المجادلۃ)

تمہیدی نکات

(۱) منتخب نصاب نمبر۲ کا درسِ نہم سورۃ المجادلۃ کی آیات ۷ تا ۱۳ کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔

(۲) منتخب نصاب نمبر۲ کے مختلف دروس سے ہم پر نہ صرف دینی فرائض کا جامع تصور واضح ہو چکا ہے بلکہ اِن فرائض کی ادائیگی کے لیے ایک منظم جماعت کا لزوم بھی ثابت ہو چکا ہے۔ اِس جماعت کو قرآنِ حکیم میں حزب اللہ کہا گیا ہے۔ اب درسِ نہم میں اِس جماعت کو نقصان پہنچانے والی ایک مہلک برائی ''نجویٰ'' کی حقیقت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِس برائی کی شدید مذمت کا بیان ہے۔

(۳) نجویٰ کہتے ہیں علیحدگی میں خفیہ سرگوشی کو۔ کچھ لوگ کسی مقصد کے تحت باہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور سرگوشی یا کھسر پھسر کریں تو اُن کا یہ عمل نجویٰ کہلاتا ہے۔ عام طور پر لوگوں کی باہم سرگوشیاں منفی کاموں اور سازشوں کے لیے ہوتی ہیں' لہٰذا قرآن نجویٰ کو ایک برائی قرار دے کر اِس کی مذمت کرتا ہے۔ جماعتی زندگی میں نجویٰ ایسے لوگوں کا گروہ کرتا ہے جو امیر سے کسی بھی وجہ سے ناراض ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ جماعت میں جتھا بنا کر ایک ساتھ بیٹھتے ہیں اور باہم سرگوشیوں کے ذریعہ قیادت پر تنقید اور اُس کے فیصلوں کو ناکام بنانے کے لیے سازشیں کرتے ہیں۔

(۴) نجویٰ کا سبب وہ بغض وعداوت ہے جو شیطان مامورین کے دلوں میں امیر کے خلاف پیدا کرتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ......﴾ (بنی اسرائیل:۵۳) ''بے شک شیطان پھوٹ ڈلوانا چاہتا ہے اُن کے درمیان......'' شیطان ہر انسان کے اندر دوسرے کے خلاف نفرت پیدا کرتا ہے۔ البتہ اُس کے حملے کا سب سے بڑا نشانہ اور ہدف حزب اللہ یعنی ایسی جماعت بنتی ہے جس کا مقصد اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کرنا ہوتا ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جو اُس سے دشمنی اور اُسے للکارنے کے لیے ہی وجود

میں آتی ہے۔ وہ اپنی چالوں کے ذریعہ اِسی جماعت میں سے منافقین کی صورت میں حزب الشیطان پیدا کر دیتا ہے۔ حزب الشیطان کے کارندے حزب اللہ کے ساتھیوں کے اندر وسوسہ اندازی کر کے اُن کے درمیان باہم نفرتیں پیدا کرتے ہیں تاکہ وہ مل کر اور یکجان ہو کر شیطان کے پھیلائے ہوئے شر کے خلاف کام نہ کر سکیں۔ خاص طور پر امیر اور مامورین کے درمیان تعلق میں بگاڑ پیدا کیا جاتا ہے تاکہ حزب اللہ اندرونی خلفشار میں مبتلا ہو کر غلبۂ دین کی کوششوں کو آگے نہ بڑھا سکے۔ جب مامورین اور اُن کے امیر کے درمیان بدگمانی اور بغض پیدا کر دیا جائے تو یہ وار زیادہ مہلک ثابت ہوتا ہے۔ کوئی اجتماعیت اُسی وقت جماعت کہلانے کی مستحق ہے جب اُس کا نظم مؤثر ہو‘ یعنی مامورین دل وجان سے اپنے امیر کی اطاعت کر رہے ہوں۔ جہاں امیر اور مامورین کے درمیان اعتماد کی فضا ختم ہوئی تو وہاں اجتماعیت جماعت نہیں بلکہ محض ایک ہجوم بن جاتی ہے۔

(۵) امیر اور مامورین کا رشتہ ایسا ہے کہ اِس میں گاہے بگاہے مامورین کی عزتِ نفس کے مجروح ہونے کا امکان کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتا ہے۔ عزتِ نفس کا مجروح ہونا مامورین کے دلوں میں امیر کے خلاف بدگمانی اور کدورت پیدا کر دیتا ہے‘ جس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں:

(i) کسی بھی انسان کی اطاعت طبیعت پر گراں گزرتی ہے۔ اِس کی ایک وجہ تکبر بھی ہے۔ انسان کسی اور کو بڑا تسلیم کر کے اُس کی اطاعت پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اُس کا نفس اُسے یہ پٹی پڑھاتا ہے کہ امیر میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ وہ مجھے حکم دے اور میں اُس کی فرماں برداری کروں۔ کیا میں اُس سے کمتر ہوں؟ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ تکبر کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ((بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ)) (صحیح مسلم) ”حق کو قبول نہ کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا“۔ جو مامور امیر کو اہلیت و صلاحیت کے اعتبار کم تر سمجھ رہا ہے اور خود کو زیادہ باصلاحیت محسوس کر رہا ہے‘ وہ کیونکر دل کو کدورت سے پاک رکھے گا اور نظم کی پابندی کرے گا۔ دورِ نبوی ﷺ میں منافقین تکبر کے اِسی مرض کا شکار تھے۔ اُن کے سامنے رسول اللہ ﷺ بشری تقاضے رکھنے والے انسان کی صورت میں موجود تھے۔ وہ قرآن کے احکامات کو اللہ تعالیٰ کے فرامین مان کر قبول کرنے کو تیار تھے لیکن آپ ﷺ کی شخصی اطاعت سے

گریز کرتے تھے‘ سورۃ النساء میں فرمایا گیا:

﴿وَاِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰی مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَاِلَی الرَّسُوۡلِ رَاَیۡتَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡکَ صُدُوۡدًا ﴿۶۱﴾﴾ (النساء)

”اور جب بھی کہا جاتا ہے اُن سے کہ آؤ اُس کلام کی طرف جو نازل کیا ہے اللہ نے اور آؤ رسولؐ کی طرف (اے نبی ﷺ!) آپ دیکھیں گے منافقوں کو کہ وہ کتراتے ہیں آپ سے رخ پھیرتے ہوئے۔“

(ii) کسی موقع پر امیر نے رفیق کا مشورہ قبول نہ کیا لہٰذا رفیق نے اُسے ذاتی توہین سمجھا کہ میری بات کو اہمیت نہیں دی گئی۔ اب دل میں کدورت پیدا ہوگئی۔ حالانکہ مامور کا کام ہے خلوص کے ساتھ مشورہ دینا۔ فیصلہ کرنا امیر کا حق ہے اور وہ فیصلہ کرتے ہوئے مختلف آراء کو گنے گا نہیں بلکہ تولے گا۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۹ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰهِ ؕ﴾ ”پس (اے نبی ﷺ!) جب آپ فیصلہ کرلیں تو اللہ پر بھروسہ کیجیے“۔ مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں آیت کے اِس حصہ کی وضاحت میں لکھا ہے کہ فیصلہ کا اختیار امیر کو ہے اور وہ کثرتِ رائے کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کا پابند نہیں ہے۔

(iii) کسی معاملہ میں رفیق نے محسوس کیا کہ امیر نے مجھے نظر انداز کیا ہے‘ اُس کی توجہ کسی اور کی طرف زیادہ رہی ہے اور مجھ سے مشورہ کیے بغیر ہی کوئی فیصلہ کرلیا ہے‘ اِس سے رفیق کے نفس کے اندر لازماً ایک ردِّعمل پیدا ہوتا ہے‘ حالانکہ یہ لازم نہیں ہے کہ امیر کسی معاملہ میں ہر ایک سے مشورہ کرے۔

(iv) کسی کوتاہی پر امیر نے سختی کی اور ڈانٹ ڈپٹ کردی۔ تربیت کے دوران نرمی اور سختی دونوں انداز اختیار کرنا پڑتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بچے کو کھلاؤ سونے کا نوالہ لیکن دیکھو شیر کی نگاہ سے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا سب سے بڑا مربی ہے‘ لیکن وہ ہمیں ڈراتا بھی ہے اور امید بھی دلاتا ہے۔ سورۃ الحجر میں فرمایا گیا:

﴿نَبِّیٴۡ عِبَادِیۡۤ اَنِّیۡۤ اَنَا الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ﴿۴۹﴾ وَاَنَّ عَذَابِیۡ هُوَ الۡعَذَابُ الۡاَلِیۡمُ ﴿۵۰﴾﴾

”(اے نبی ﷺ!) بتا دیجیے میرے بندوں کو کہ میں ہی بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہوں‘ اور بے شک میرا عذاب ہی دردناک عذاب ہے۔“

(v) امیر نے کسی کوتاہی پر یا بغیر وجہ بتائے کسی ذمہ داری سے معزول کر دیا۔ اب ہونا تو یہ چاہیے کہ اس پر ہم سکون محسوس کریں‘ کیونکہ ذمہ داری ایک بہت بڑا بوجھ ہے‘ لیکن اگر خدانخواستہ دل میں کچھ خود پسندی ہے‘ کچھ دنیا کی محبت ہے تو آدمی چاہتا ہے کہ میں کسی منصب پر رہوں تاکہ تنظیم وتحریک میں میرا مقام نمایاں رہے۔

(vi) کسی موقع پر رخصت طلب کی اور امیر نے رخصت دینے سے انکار کر دیا۔

ان اسباب کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ مامورین اور امیر کے درمیان اختلافات کے کچھ حقیقی اسباب ہوں‘ مثلاً:

(i) اختلافات کا پیدا ہونا ایک فطری عمل ہے کیونکہ ہر انسان کا مزاج‘ ترجیحات‘ اقدار‘ تربیت کا ماحول و معیار‘ سوچنے کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ اِس وجہ سے کوئی مامور قیادت کی طرف سے طے کیے گئے لائحہ عمل یعنی پالیسی کو تحریک کے مقاصد کے لیے مضر سمجھتا ہے۔

(ii) کسی ذمہ دار کے طرزِ عمل کو تحریک کے مقاصد یا نیک نامی کے حوالے سے درست نہ سمجھا جائے۔

(iii) نظم بالا کی طرف سے کوئی حق تلفی یا زیادتی ہو جائے‘ مثلاً امیر نے کسی مغالطے‘ کسی غلط اطلاع یا بدگمانی کی بنیاد پر رفیق کو خواہ مخواہ ڈانٹ دیا۔ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ تو اِس طرح کی کمزوریوں سے بَری ہے لیکن کوئی اور تو اِس سے بَری نہیں ہے۔ بہرحال یہ ڈانٹ بھی مامور کے لیے امیر سے ناراضگی کا سبب بن سکتی ہے۔

(۶) مذکورہ بالا اسباب مامور کے دل میں امیر کے خلاف میل پیدا کر دیتے ہیں۔ اگر اس میل کو شعوری طور پر صاف نہ کیا جائے اور وہاں کھردری سطح برقرار رہے تو مزید میل جمع ہوگا جو بڑے فساد کا باعث بن جائے گا۔ دل میں پیدا ہونے والی میل کو صاف کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اوّلاً سوئے ظن سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ سورۃ الحجرات آیت ۱۲ میں ارشاد ہوا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ ”اے ایمان والو! بہت زیادہ گمان کرنے سے بچو! یقیناً بعض گمان گناہ ہیں“۔ البتہ اگر دل سے میل نہ صاف ہوتا ہو تو ایسے فورم پر اپنی شکایت پیش کی جائے جسے اختلافات حل کرنے کا اختیار حاصل ہو۔ کسی دوسری سطح پر اختلاف کا بیان اجتماعیت میں انتشار پیدا

کرتا ہے۔ سورۃ المجادلہ کی پہلی آیت میں حزب اللہ کا یہ وصف بیان کیا گیا ہے کہ اِس سے تعلق رکھنے والا فرد اختلافِ رائے کا اظہار درست فورم پر کرتا ہے۔ ایک خاتون حضرت خولہ بنت ثعلبہ ؓ کے شوہر حضرت اوس بن صامت ؓ نے اُن سے ظہار کر لیا یعنی قسم کھا کر کہا کہ تم میرے لیے ماں کی طرح محترم ہو۔ دورِ جاہلیت میں ظہار کرنے سے ایک شخص کی بیوی اُس پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی تھی۔ حضرت خولہؓ نے نبی اکرم ﷺ سے درخواست کی کہ میرے شوہر بوڑھے اور بچے ابھی چھوٹے ہیں‘ پورا خاندان مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا‘ لہٰذا آپ اِس مسئلہ میں کوئی رعایت فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ابھی شریعت میں اِس مسئلے کے بارے میں ہدایت نہیں آئی۔ فی الحال اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لو۔ اُس خاتون نے آپ ﷺ کے ادب و احترام کا پورا لحاظ کرتے ہوئے آپ ﷺ سے بحث کی۔ حضرت عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں کہ گفتگو کے دوران اُن کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ میں نہ سن سکی‘ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کی فریاد سن لی۔ بے شک اللہ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ اللہ ربّ العزت نے اُسی وقت آپ ﷺ پر وحی نازل فرمائی اور ظہار کے حوالے سے شریعت کی ہدایات عطا فرمائیں۔

(۷) اگر امیر کے خلاف پیدا ہونے والی کدورت کو دور نہ کیا گیا تو پھر رفتہ رفتہ اجتماعیت میں بگاڑ بڑھتا چلا جائے گا جس کے مظاہر یہ ہو سکتے ہیں:

(i) امیر کے ہر فیصلے اور اقدام کے بارے میں سوئے ظن ہوگا‘ اُس میں منفی پہلو ہی نظر آئیں گے اور اُس سے مضر اثرات کے خدشات محسوس ہوں گے۔

(ii) امیر سے ناراض اور نالاں رفقاء آپس میں قریب ہوں گے اور ایک جتھہ کی صورت اختیار کریں گے۔ اِن کے قریب آنے کی اساس منفی ہوگی یعنی امیر سے ناراضگی۔

(iii) یہ جتھہ علیحدگی میں مل کر اپنے دکھ کو ایک دوسرے کے سامنے بیان کرے گا۔ ایسے لوگ بظاہر بڑے ہمدردانہ انداز میں اور جماعت کی اصلاح کے لیے مشورے کر رہے ہوتے ہیں لیکن درحقیقت جماعت کی شیرازہ بندی کے اعتبار سے انتشار اور فساد پیدا کر رہے ہوتے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں اس کا نقشہ یوں کھینچا گیا:

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝۱۱﴾

﴿اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ۱۱﴾ (البقرۃ)

’’اور جب بھی کہا جاتا ہے اُن سے فساد نہ پھیلاؤ زمین میں وہ کہتے ہیں بے شک ہم تو ہیں ہی اصلاح کرنے والے۔ سن لو! بے شک وہی فساد پھیلانے والے ہیں‘ لیکن وہ نہیں سمجھ رہے۔‘‘

قیادت کے خلاف ایسے لوگوں کی کھسر پھسر اور سرگوشیوں کو قرآنِ حکیم نجویٰ قرار دیتا ہے اور سورۃ المجادلۃ آیات ۷ تا ۱۳ میں ایسا کرنے سے منع فرماتا ہے۔

آیات پر غور وفکر

آیت ۷

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ﴾ ’’کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے‘‘......﴿مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّا ھُوَ رَابِعُھُمْ﴾ ’’نہیں ہوتی تین کی سرگوشی مگر وہ اُن کا چوتھا ہوتا ہے‘‘......﴿وَلَا خَمْسَۃٍ اِلَّا ھُوَ سَادِسُھُمْ﴾ ’’اور نہ ہی پانچ کی مگر وہ اُن کا چھٹا ہوتا ہے‘‘...... ﴿وَلَآ اَدْنٰی مِنْ ذٰلِکَ وَلَآ اَکْثَرَ﴾ ’’اور نہ اِس سے کم ہوتے ہیں اور نہ زیادہ‘‘...... ﴿اِلَّا ھُوَ مَعَھُمْ﴾ ’’مگر وہ اُن کے ساتھ ہوتا ہے‘‘......﴿اَیْنَ مَا کَانُوْا﴾ ’’جہاں کہیں وہ ہوتے ہیں‘‘......﴿ثُمَّ یُنَبِّئُھُمْ بِمَا عَمِلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ؕ﴾ ’’پھر وہ بتائے گا اُنہیں جو اُنہوں نے کیا قیامت کے دن‘‘......﴿اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۷﴾ ’’بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔‘‘

اِس آیتِ مبارکہ میں اس حقیقت کی یاد دہانی کرائی گئی کہ اللہ تعالیٰ کائنات کی ہر شے اور ہر بات سے ہر وقت واقف ہوتا ہے۔ دو یا اُس سے زائد افراد خواہ کتنی ہی رازداری سے سرگوشی کریں‘ اللہ تعالیٰ اُن کی گفتگو کو نہ صرف سن رہا ہوتا ہے بلکہ اُسے محفوظ (record) بھی کر رہا ہوتا ہے۔ پھر خواہ سرگوشیاں کسی گہری کھوہ میں چھپ کر کی جائیں‘ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر کی جائیں یا فضا کی بلندیوں میں پہنچ کر کی جائیں‘ اللہ تعالیٰ وہاں موجود ہوتا ہے۔ روزِ قیامت وہ ہر انسان کو آگاہ فرمادے گا کہ اُس نے کس جگہ اور کس موقع پر کسی اور کے ساتھ کیا سرگوشی کی تھی۔ اللہ تعالیٰ یہ حقیقت ہمیں ہر وقت یاد رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

آیت ۸

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ نُھُوْا عَنِ النَّجْوٰی﴾ ’’کیا تم نے نہیں دیکھا اُن لوگوں کو جنہیں

روکا گیا تھا سرگوشی سے‘‘......﴿ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا نُھُوْا عَنْہُ﴾ ’’پھر وہ وہی کر رہے ہیں جس سے اُنہیں روکا گیا تھا‘‘......﴿وَیَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِیَتِ الرَّسُوْلِ ۫﴾ ’’اور وہ باہم سرگوشی کرتے ہیں گناہ اور زیادتی اور رسولؐ کی نافرمانی کے لیے‘‘...... ﴿وَاِذَا جَآءُوْکَ﴾ ’’اور (اے نبیﷺ!) جب وہ آتے ہیں آپ کے پاس‘‘......﴿حَیَّوْکَ بِمَا لَمْ یُحَیِّکَ بِہِ اللّٰہُ ۙ﴾ ’’سلام کہتے ہیں آپؐ کو اُن الفاظ سے جن سے نہیں سلام کہا آپؐ کو اللہ نے‘‘...... ﴿وَیَقُوْلُوْنَ فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ﴾ ’’اور کہتے ہیں اپنے جیوں میں‘‘...... ﴿لَوْ لَا یُعَذِّبُنَا اللّٰہُ بِمَا نَقُوْلُ ؕ﴾ ’’کیوں نہیں سزا دیتا ہمیں اللہ اُس پر جو ہم کہتے ہیں!‘‘......﴿حَسْبُھُمْ جَھَنَّمُ ۚ﴾ ’’کافی ہے اُن کے لیے جہنم‘‘...... ﴿یَصْلَوْنَھَا ۚ﴾ ’’وہ داخل ہوں گے اُس میں‘‘...... ﴿فَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۸﴾ ’’پس وہ بہت بری ہے لوٹنے کی جگہ۔‘‘

- یہ آیت آگاہ کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو پہلے ہی خبردار فرما چکا ہے کہ وہ نجویٰ نہ کریں۔ ممکن ہے کہ اِس آیت میں اشارہ سورۃ النساء کی آیت ۱۱۴ کی طرف ہو جس میں خبریہ اسلوب میں نجویٰ کرنے والوں کی بہت سی سرگوشیوں کی خرابی بیان کی گئی اور سرگوشی کی پسندیدہ صورتوں کو بھی واضح کیا گیا۔ ارشاد ہوا:

﴿لَا خَیْرَ فِیْ کَثِیْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىھُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَۃٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَیْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ فَسَوْفَ نُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا ۱۱۴﴾ (النساء)

’’کوئی بھلائی نہیں اُن کی بہت سی سرگوشیوں میں سوائے اُس کے جو ترغیب دے صدقہ کی یا نیکی کی یا لوگوں کے درمیان صلح کرانے کی۔ اور جس نے ایسا کیا حاصل کرنے کے لیے اللہ کی رضا تو عنقریب ہم دیں گے اُسے شاندار بدلہ۔‘‘

گویا اکثر و بیشتر سرگوشی خرابی کی جڑ بنتی ہے۔ وہی بات بہتر ہوتی ہے جو کھل کر سامنے کی جائے۔ اگر کسی کو اُس کے سامنے تنقید کا نشانہ بنایا جائے تو اُس کے لیے موقع ہوتا ہے کہ وہ وضاحت کر کے اپنا دفاع کر سکے۔ لیکن اگر کسی پر تنقید اُس کی غیر موجودگی میں کی جائے گی تو اِس سے اصلاح تو نہ ہو سکے گی لیکن باہمی نفرت اور فساد میں اضافہ ہوگا۔ البتہ ہر چیز میں استثناء ہوتا ہے۔ نجویٰ کی پسندیدہ صورت یہ ہے کہ تنہائی میں کسی کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کرنے کی ترغیب دی جائے‘ کسی نیکی کی طرف مائل کیا جائے یا باہم اختلافات کو ختم

کرنے کی کوشش کی جائے۔ بشارت دی گئی کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ایسا کرے گا عنقریب اللہ تعالیٰ اُسے شاندار بدلہ عطا فرمائے گا۔

- سورۃ النساء کی آیت ۱۱۴ سن کر ایسے لوگ تو منفی سرگوشیوں سے رک گئے جن کے دلوں میں کچھ نہ کچھ ایمان تھا‘ البتہ منافقین باز نہ آئے اور اُنہوں نے یہ مذموم حرکت جاری رکھی۔ یہ لوگ مسلمانوں میں ہی شمار ہوتے تھے لیکن شیطان کے حملوں کا شکار ہو کر خفیہ سرگوشیوں کے ذریعہ سازشیں کرتے تھے۔ شیطان ایسے لوگوں میں بزدلی پیدا کر دیتا ہے جس کی وجہ سے اُن کی سرگرمیاں گھٹیا صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ بزدلی کی وجہ سے وہ صحیح فورم پر اظہارِ اختلاف نہیں کرتے اور نہ ہی جماعت سے علیحدہ ہونے کی جرأت کرتے ہیں‘ بلکہ جماعت کے اندر رہ کر نجویٰ یعنی خفیہ سرگوشیوں کے ذریعہ اپنے ہم خیال بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم خیالوں کے بڑھنے سے ایک طرف جماعت میں انتشار بڑھتا ہے اور دوسری طرف تحریک کے تقاضوں کے حوالے سے اُن کی ذاتی کمزوریوں پر بھی پردہ پڑ جاتا ہے۔ نوٹ کیجیے کہ جب صحابہ کرام ؓ جیسی پاکیزہ ہستیوں کے ساتھ ایسے عناصر موجود تھے تو کیا آج مسلمانوں کی صفوں میں ایسے عناصر موجود نہ ہوں گے؟ اِس اعتبار سے ہم یہ نہ سمجھیں کہ اِن باتوں کا ہم سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ آج بھی خطرہ ہے کہ کہیں ہم شیطان کے اکسانے پر منافقانہ کردار اختیار کر لیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین!
- یہ آیت آگاہ کر رہی ہے کہ منافقین کی سرگوشیاں تین برائیوں کے لیے ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ایک دوسرے کو گناہوں پر اکساتے ہیں۔ فرائض ادا نہ کرنے اور حرام کاموں کا ارتکاب کرنے کی پٹی پڑھاتے ہیں۔ دین کے لیے قربانیاں دینے والے مخلص مؤمنوں کو پاگل اور بے وقوف قرار دے کر ایک دوسرے کو بظاہر بڑی خیر خواہی کے ساتھ مال اور جان بچا بچا کر رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ وہ کسی کے ساتھ زیادتی اور حق تلفی کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ کسی کی جان‘ مال یا عزت کو نقصان پہنچانے کی سازش کرتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ایک دوسرے کو رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی پر آمادہ کرتے ہیں۔ یہاں رسول ﷺ کی حیثیت کو سمجھنا ہوگا۔ وہ اللہ کے پیغمبر ہیں‘ مسلمانوں کی جماعت کے امیر ہیں اور اسلامی ریاست کے سربراہ بھی ہیں۔ جو لوگ اُنہیں اللہ کا پیغمبر مانیں گے‘ وہ کبھی بھی اُن کی نافرمانی کے بارے میں سرگوشی نہیں کریں گے۔ گویا یہاں اگر امکان ہے تو آپ ﷺ

کی امیر جماعت یا سربراہِ ریاست کی حیثیت کا۔ اب اگر اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ ایسا ہو سکتا ہے تو بعد میں جتنے بھی اسلامی ریاست کے سربراہ مسلمانوں کی جماعت کے امیر ہوں گے‘ اُن کی نافرمانی کے لیے خفیہ سرگوشیوں کے امکانات اور زیادہ ہوں گے۔

- منافقین آپ ﷺ کو دل سے اللہ کا پیغمبر نہیں مانتے تھے‘ لہٰذا اُن کی خباثت کا حال یہ تھا کہ آپ ﷺ کو **السَّلامُ علیك** (آپ پر سلامتی ہو) کہنے کے بجائے **السَّامُ علیك** (آپ پر تباہی آئے‘ معاذ اللہ!) کہنے کی گستاخی کرتے تھے۔ اب شیطان اُنہیں پٹی پڑھاتا کہ دیکھو تم نے اُن کے ساتھ گستاخی کی۔ اگر وہ اللہ کے رسول ہوتے تو تمہیں اللہ کی طرف سے سزا دی جاتی۔ سزا کا نہ ملنا اِس بات کی دلیل ہے کہ وہ سچے رسول نہیں ہیں۔ گویا منافقین اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی مہلت کا غلط نتیجہ نکال لیتے تھے۔ ایسے بدبختوں کے لیے جہنم میں بدترین عذاب ہے۔ جب اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف منافقین گستاخانہ باتیں کر سکتے ہیں تو آج تو اِس کردار کے لوگ اِس حوالے سے اور جری ہوتے ہیں۔ وہ لوگ اپنے دل کی کدورت کے اظہار کے لیے زبان سے بعض اوقات ناگوار فقرے امیر کے خلاف چست کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی گھٹیا حرکت سے محفوظ فرمائے۔ آمین!
- کسی بھی اجتماعیت میں اختلافِ رائے کا ہونا اور فیصلوں پر تنقید کرنا اُس اجتماعیت کے زندہ اور صحت مند ہونے کی علامت ہے‘ بشرطیکہ ایسا کرتے ہوئے متعلقہ آداب کو ملحوظ رکھا جائے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ایسا کرتے ہوئے نیت اصلاح کی ہو‘ نہ کہ کسی کی عزت و آبرو پامال کرنے کی۔ پھر اختلاف اور تنقید اُس فورم پر پیش کی جائے جہاں سے اصلاح ہونے کا امکان ہے۔ اگر اپنے کسی بھائی میں کوئی قابلِ اصلاح پہلو نظر آئے تو اُسے علیحدگی میں بالمشافہ گفتگو کے ذریعے اصلاح کی جانب متوجہ کیا جائے اور اِس سلسلے میں ایک مناسب مدت تک انتظار بھی کیا جائے کہ شاید وہ اپنی اصلاح کر لے۔ اصلاح کی جانب متوجہ کرتے ہوئے اندازِ گفتگو دلسوزی اور ہمدردی والا ہو۔ وہ بھائی محسوس کرے کہ اُس کی کمزوری بیان کر کے اصلاح کرنے والا نہ خوش ہو رہا ہے‘ نہ لذت لے رہا ہے‘ نہ اُس کی توہین کر رہا ہے‘ نہ اُسے صدمہ پہنچا رہا ہے اور نہ اپنی بڑائی کا اظہار کر رہا ہے۔ اگر کسی بھائی کو متوجہ کرنے کا امکان نہ ہو یا بار بار متوجہ کرنے کے باوجود وہ اصلاح قبول نہ کر رہا ہو

تو پھر بالاتر اصحابِ امر تک اطلاع پہنچادی جائے اور سمجھ لیا جائے کہ اب ہماری ذمہ داری ختم ہوگئی ہے۔ یہ شرائط پوری نہ ہوں تو تنقید مہلک اور مضر ثابت ہوتی ہے اور اپنی افادیت کا پہلو کھو دیتی ہے۔

- اگر کسی بھائی پر تنقید دوسروں کی موجودگی میں ہوگی تو ''ھمز'' اور ''لمز'' کے حکم میں ہوگی جس پر سورۃ الھمزۃ میں ''وَیل'' کی وعید وارد ہوئی ہے۔ اِسی طرح اگر تنقید اُس بھائی کی غیر حاضری میں ہوگی تو ''غیبت'' کے حکم میں آئے گی جسے قرآن مجید میں مُردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پھر اگر غیبت اصحابِ امر کے خلاف ہو تو یہ کئی گنا زیادہ قبیح اور مہلک ہے۔ نظم تو ہے ہی یہ کہ اپنے سے اوپر کے ذمہ دار کی اطاعت کی جائے۔ جب اُس کا احترام دل میں نہ رہا اور پھر دوسروں کے سامنے بھی اُس کی برائیوں کا چرچا کر کے اُس کے احترام کو اُن کے دلوں میں بھی مجروح کرنا جماعت کی شیرازہ بندی بالکل ہی بکھیر دینے کے مترادف ہے۔ مامورین کونوں کھدروں میں سرگوشیاں کر رہے ہوں گے۔ آپس میں بظاہر بہت دردمندی کے ساتھ مشورے اور تبصرے ہو رہے ہوں گے۔ کہیں گے ہم تو اجتماعیت کی بہتری چاہتے ہیں لیکن امیر صاحب غلط رخ پر چل پڑے ہیں' اُن کے انداز اور فیصلوں سے اجتماعیت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ ایسے لوگ بظاہر اجتماعیت کی بہتری کی بات کر رہے ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں اجتماعیت کی جڑیں کھود رہے ہوتے ہیں۔ وہ دیمک کی طرح اندر سے اجتماعیت کو کھوکھلا کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر اِن منفی سرگرمیوں کی روک تھام نہ کی جائے تو کچھ ہی عرصہ میں اُس اجتماعیت کا رعب اور قوت ختم ہو جائے گی۔
- سوچنے کی ضرورت ہے کہ جب نبی اکرمﷺ کی حیاتِ طیبہ میں آپﷺ کے سلسلہ میں نجویٰ ہوتا تھا اور بار بار منع کرنے کے باوجود بھی کیا جاتا تھا تو آج اِس کا امکان کئی گنا زیادہ ہے۔ لہٰذا ہمیں حد درجہ چوکنا رہنا چاہیے اور حسبِ ذیل امور کا اہتمام کرنا چاہیے:

(i) اختلافِ رائے کے حوالے سے متعلقہ آداب کا خیال رکھا جائے اور بار بار اجتماعات میں اِن آداب کی یاد دہانی کرا کے اُنہیں ذہن نشین کرایا جائے۔ یہ بات ذہنوں میں بٹھا دی جائے کہ اختلاف کا اِظہار ہمیشہ صحیح اور بااختیار فورم پر کیا جائے تاکہ اختلاف کو ختم کرنے کے لیے اقدام کیا جاسکے۔ درست فورم کو چھوڑ کر ادھر ادھر اظہارِ اختلاف کرنا ایک تخریبی عمل ہے۔

(ii) کوئی ساتھی اگر بالاتر اصحابِ امر کے حوالے سے اختلافِ رائے یا منفی تأثر کا اظہار کرے تو اُسے مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے ورنہ خاموش رہا جائے۔ اُس پر کوئی ایسی بات' کوئی ایسا اشارہ یا ہلکا پھلکا تبصرہ (*loose comment*) نہ کیا جائے جس سے مخاطب یا کسی اور ساتھی کے اندر متعلقہ ذمہ دار کی اطاعت کا جذبہ ڈھیلا پڑ جانے کا امکان ہو۔ یہاں تک کہ مسکرایا بھی نہ جائے کیونکہ بعض اوقات مسکراہٹ بھی بڑا گہرا پیغام (*deep message*) منتقل (*convey*) کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اِس بے احتیاطی سے محفوظ فرمائے۔ آمین!

یہ بھی ملحوظ رہے کہ عام طور پر ایسے شخص کی واہ واہ ہوتی ہے جو نظمِ بالا سے اختلاف کرے اور اُسے بہت بہادر (*Bold*) سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو نظمِ بالا کا وفادار ہو' اُسے پسند نہیں کیا جاتا۔ اس سب کے باوجود ہم نے نظم بالا کے کیے گئے فیصلوں کی مامورین کے سامنے تائید کرنی ہے اور اگر ہمیں خود کسی فیصلہ پر انشراح نہیں تو پھر بھی خاموش رہ کر ہر طرح سے نظم بالا کے ساتھ خلوص اور وفاداری کا ثبوت دینا ہے۔

(iii) جب بھی کوئی ساتھی اختلافِ رائے کے اظہار کے لیے متعلقہ آداب کی خلاف ورزی کرے تو اُسے توجہ دلائی جائے۔ اصلاح نہ ہونے پر اُس میں خدا خوفی کا احساس پیدا کیا جائے۔ بعض ساتھی ایسے ہوتے ہیں کہ بار بار توجہ دلانے کے باوجود انتشار پیدا کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر وہ باز نہ آئیں تو نظم بالا کو اُس کی اطلاع دے کر کردار ادا کرنے کی سفارش کی جائے۔

(iv) جو ساتھی اختلافِ رائے یا نظم بالا کے احترام کے حوالے سے آداب و اخلاقیات کا التزام نہیں کرتے' اُن کے لیے خلوصِ دل سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہدایت کی دعا کرنی چاہیے اور یہ دعا بھی کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ منفی روش کے مضر اثرات سے اجتماعیت کو محفوظ فرمائے۔ آمین!

(v) اپنے لیے خصوصی دعا کی جائے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں شیطان کے حملوں اور نفاق کی بیماری سے محفوظ فرمائے۔ آمین!

اَللّٰھُمَّ طَھِّرْ قُلُوْبَنَا مِنَ النِّفَاقِ وَاَعْمَالَنَا مِنَ الرِّیَاءِ وَاَلْسِنَتَنَا مِنَ الْکَذِبِ وَاَعْیُنَنَا مِنَ الْخِیَانَۃِ فَاِنَّکَ تَعْلَمُ خَائِنَۃَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ ——— آمین!

آیت ۹

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا﴾ ’’اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو!‘‘...... ﴿اِذَا تَنَاجَیْتُمْ﴾ ’’جب تم باہم سرگوشی کرو‘‘...... ﴿فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِیَتِ الرَّسُوْلِ﴾ ’’تو سرگوشی نہ کرو گناہ اور زیادتی اور رسولؐ کی نافرمانی کے لیے‘‘...... ﴿وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰی﴾ ’’اور سرگوشی کرو نیکی اور تقویٰ کے لیے‘‘...... ﴿وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْۤ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ ۝۹﴾ ’’اور بچو اُس اللہ کی نافرمانی سے جس کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے۔‘‘

- اِس آیتِ مبارکہ میں ایمان والوں کو ہدایت دی گئی کہ وہ منافقانہ طرزِ عمل سے بچیں اور گناہ کی باتوں‘ زیادتی اور قیادت کی نافرمانی کے حوالے سے باہم سرگوشیاں نہ کریں۔ کوئی بھی ایسی بات یا حرکت نہ کریں جس سے سننے والوں میں اصحابِ امر کے احترام یا اطاعت کے جذبہ میں کمی آ جائے۔ یہ معاملہ مذاق یا خوش طبعی میں بھی نہ کیا جائے کیونکہ بعض سننے والے ذہنی طور پر زیادہ پختہ نہیں ہوتے اور وہ مذاق والی باتوں کو بھی سنجیدہ لے لیتے ہیں۔
- آیتِ مبارکہ میں تلقین کی گئی ہے کہ اگر نجویٰ کرنا ہی ہے تو تنہائی میں کسی کو نیکی کرنے اور تقویٰ یعنی گناہ سے بچنے کی ترغیب دو۔ لوگوں کو بھلائی کے کاموں کے لیے آمادہ کرو۔ نیکی کے لیے اگر کسی کی طبیعت میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے یا اُس کی ہمت پست ہو رہی ہے تو اُس کی حوصلہ افزائی کرو۔ نافرمانیوں کے حوالے سے اُسے اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے ڈراؤ۔ اُس میں اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری اور آخرت میں جواب دہی کے حوالے احساس پیدا کرنے کی کوشش کرو۔

آیت ۱۰

﴿اِنَّمَا النَّجْوٰی مِنَ الشَّیْطٰنِ﴾ ’’بے شک سرگوشی تو شیطان ہی کی طرف سے ہے‘‘...... ﴿لِیَحْزُنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ’’تاکہ وہ غمگین کرے اُنہیں جو ایمان لائے‘‘...... ﴿وَلَیْسَ بِضَآرِّھِمْ شَیْئًا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ﴾ ’’اور وہ نہیں ہے نقصان پہنچانے والا اُنہیں کچھ بھی مگر اللہ کے حکم سے‘‘...... ﴿وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰﴾ ’’اور اللہ ہی پر پھر بھروسہ کرنا چاہیے مؤمنوں کو۔‘‘

- آیت ۹ میں ارشاد ہوا کہ اگر تنہائی میں جا کر کسی کو نیکی اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچنے کی تلقین کی جائے تو ایسا نجویٰ پسندیدہ ہے۔ اِس آیت میں آگاہ کیا گیا کہ اگر تنہائی میں کسی

کو گناہ‘ زیادتی اور قیادت کی نافرمانی پر اکسایا جائے تو ایسا نجویٰ برا اور شیطان کا سکھایا ہوا ہے۔ شیطان نجویٰ کا جال بچھاتا ہے اور اِس میں خوش نمائی پیدا کرتا ہے۔ اِس طرح وہ مامورین میں بے چینی اور انتشار پیدا کر کے حزب اللہ کو کمزور کرنا چاہتا ہے اور جماعت کے مخلص ساتھیوں کو دکھ اور رنج دینا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اُن کی یکسوئی اور یک جہتی مجروح ہو اور اُن پر مایوسی چھا جائے۔ مخلص ساتھیوں کے دکھ کا مشاہدہ ذہن کی آنکھوں سے کیا جا سکتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کس طرح جماعت کے امیر اور داعیوں نے طویل محنت کے ذریعہ ساتھیوں کو جمع کیا ہے اور جماعت بنائی ہے۔ خون پسینہ سے جس درخت کی آب یاری کی ہے اب کچھ لوگ اُس کی جڑیں کھود رہے ہیں۔ تنکا تنکا چُن کر جو گھونسلہ بنایا گیا ہے اب کچھ لوگ اُسے جلانے کے درپے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کوئی شخص چند ساتھیوں کو لے کر بیٹھا ہوا ہے۔ گناہ‘ زیادتی اور قیادت کی نافرمانی پر اکسا کر اُن کے ایمان پر ڈاکہ ڈال رہا ہے۔ غلط فہمیاں پیدا کر کے اُن کے جذبۂ عمل کو سرد کر رہا ہے۔ مختلف حوالوں سے اعتراضات کر کے اور نئے نئے فتنے اٹھا کر اُن کے ذہنوں میں اشکالات پیدا کر رہا ہے۔ اِس سے مخلص ساتھیوں کے دل پر جو بیتتی ہے اور جو درد اُنہیں پہنچتا ہے اُسے وہی سمجھ سکتا ہے جو اِس کرب سے گزرا ہے۔ اُنہیں افسوس ہوتا ہے کہ یہ شخص نظم کے تحت وقت دینے کو تیار نہیں‘ اجتماعات میں آنے کے لیے اِس کے پاس فرصت نہیں لیکن سرگوشیاں کرنے اور غیبت کی محفلیں جمانے کے لیے اِس کے پاس بہت وقت ہے۔

- مخلص ساتھیوں کو اطمینان دلانے اور اُن کی دل جوئی کے لیے ارشاد ہوا کہ اصل نتائج اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اور اُس کے اِذن کے بغیر کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ شیطان کا کوئی وار کارگر ہوتا بھی ہے تو اللہ تعالیٰ کے اِذن سے۔ اِس میں بھی کوئی خیر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اُسے تمہاری تربیت اور اصلاح کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ جتھا بنا کر سازشیں کرنے والوں کی حرکتوں کا دلوں پر اثر نہ لو اور نہ ہی ردِّعمل میں کوئی زیادتی کرو۔ ممکن حد تک سازشوں کا سدباب کرو اور مطمئن رہو کہ اگر تمہارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ صاف ہے تو کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ سورۂ آلِ عمران‘ آیت ۱۲۰ میں ارشاد ہوا: ﴿وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُھُمْ شَیْئًا ط﴾ ’’اور اگر تم صبر کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو تو نہیں نقصان پہنچائے گی تمہیں اُن کی سازش کچھ بھی۔‘‘

- آیت کے آخر میں ارشاد ہوا کہ مؤمنوں کو اللہ تعالیٰ پر ہی مکمل بھروسہ اور توکل کرنا چاہیے۔ اُس سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ سازشیں کرنے والوں کو ہدایت عطا فرمائے۔ اگر اُن کی قسمت میں ہدایت نہیں ہے تو اُن کی سازشوں کے اثرات کو زائل فرما دے اور اُن کے شر سے پوری جماعت کو محفوظ فرما دے۔

آیت ۱۱

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا﴾ ''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو!'' ...... ﴿اِذَا قِیۡلَ لَکُمۡ تَفَسَّحُوۡا فِی الۡمَجٰلِسِ فَافۡسَحُوۡا﴾ ''جب کہا جائے تم سے کھل جاؤ مجلسوں میں تو کھل جایا کرو'' ...... ﴿یَفۡسَحِ اللّٰهُ لَکُمۡ﴾ ''کشادگی دے گا تمہیں اللہ'' ...... ﴿وَاِذَا قِیۡلَ انۡشُزُوۡا فَانۡشُزُوۡا﴾ ''اور جب کہا جائے کھڑے ہو جاؤ تو کھڑے ہو جایا کرو'' ...... ﴿یَرۡفَعِ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ﴾ ''بلند کر دے گا اللہ اُن کو جو ایمان لائے تم میں سے'' ...... ﴿وَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ دَرَجٰتٍ﴾ ''اور اُن کو جنہیں علم دیا گیا ہے درجوں میں'' ...... ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ﴿۱۱﴾﴾ ''اور اللہ اُس سے جو تم کرتے ہو خوب باخبر ہے۔''

- عمومی طور پر اِس آیت سے مجلس کے آداب کے حوالے سے رہنمائی حاصل ہو رہی ہے۔ مجلس کے دوران ہمیں میرِ مجلس کی ہدایات پر عمل کرنا چاہیے۔ اگر کہا جائے کہ آگے آ کر بیٹھو تو فوراً آگے آ جانا چاہیے۔ اگر ہدایت دی جائے کہ ذرا کھل کر بیٹھو اور بعد میں آنے والے ساتھیوں کے لیے گنجائش پیدا کرو تو ایسا کرنا چاہیے۔ اسی طرح مجلس برخواست ہونے کے اعلان کے ساتھ ہی اٹھ جایا جائے اور غیر ضروری طور پر رک کر میرِ مجلس کے وقت کو ضائع نہ کیا جائے۔ البتہ ماقبل آیات کے ساتھ ربط کے حوالے سے اِس آیت میں دینی اجتماعیت کو انتشار سے بچانے کے لیے خصوصی ہدایات دی گئی ہیں۔
- قیادت سے ناراض لوگ جو آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں‘ اجتماعات میں آ کر ایک ساتھ بیٹھتے ہیں‘ دورانِ اجتماع آنکھوں سے اشارے کرتے ہیں‘ ایک دوسرے کو کہنی مار کر تبصرے کرتے ہیں اور بعض اوقات طنزیہ لیکن دلچسپ فقرے چست کرتے ہیں‘ سادہ لوحی میں بعض ساتھی اُن کے پاس بیٹھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اِن حرکات سے اجتماع کی کارروائی کے اثرات زائل ہوتے ہیں اور امیر کا احترام اور تقدس مجروح ہوتا ہے۔ اجتماع میں آمد کا مقصد کچھ اور ہوتا ہے اور ہم کچھ اور کر رہے ہوتے ہیں۔ اجتماع میں آئے تھے

تاکہ امیر کی گفتگو اور ہدایات سنیں‘ جو بھی وعظ و نصیحت ہو اُس سے استفادہ کریں‘ لیکن ایسے لوگ کچھ اور ہی کر رہے ہوتے ہیں۔ اِس قسم کی حرکات کے سدِباب کے لیے اِس آیت میں ہدایات دی جا رہی ہیں۔

- آیتِ مبارکہ میں ارشاد ہوا کہ جب تم سے کھل کر بیٹھنے کو کہا جائے تو کھل کر بیٹھ جایا کرو‘ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کشادگی پیدا کرے گا۔ کھل کر بیٹھنے کا حکم اِس لیے تھا کہ جتھا بنا کر بیٹھنے والے نہیں چاہتے تھے کہ اُن کے درمیان کوئی اور آ کر بیٹھ جائے۔ اُنہیں ڈر تھا کہ اگر اُن میں کوئی دوسرا آدمی شامل ہو گیا تو اُس کے علم میں اُن کی منفی باتیں آ جائیں گی اور نظم بالا تک اُن کی شکایت پہنچ جائے گی۔ اِس آیت کے حکم کا ایک مقصد یہ تھا کہ اُن کے درمیان کوئی اور آنے والا بیٹھ سکے اور اُن کے مل کر بیٹھنے سے جو فساد پیدا ہو رہا ہے اس کی روک تھام کی جا سکے۔
- قیادت سے ناراض لوگ اجتماع کے دوران تو گھڑی دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ بہت وقت ہو گیا‘ کافی طویل دورانیہ کا اجتماع ہو گیا اور ہمیں کچھ اور کام بھی تو کرنے ہیں۔ گویا منتظمین پر مسلسل دباؤ ہوتا ہے کہ اجتماع کی کارروائی ختم کی جائے۔ پھر جب اجتماع ختم ہو جاتا ہے تو اب کچھ لوگوں کے ساتھ گپ شپ ہو رہی ہے‘ کارروائی پر تبصرے کیے جا رہے ہیں اور اگر کسی پر اجتماع کا اثر ہوا ہے تو اُسے زائل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اِس لیے اہلِ ایمان سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تمہیں کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو۔ بعض اوقات کسی اجتماع میں یہ صورت بھی پیش آتی ہے کہ دو حضرات آپس میں سرگوشی کر رہے ہیں‘ اِس سے اجتماع کی تاثیر متاثر ہوتی ہے۔ جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ آپ میں سے ایک اُٹھ کر دوسری جگہ پر بیٹھ جائے تو اُنہیں ناگوار محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ جو صاحبِ علم ہو گا اور جس کے دل میں ایمان کی رمق ہو گی وہ امیر کے اِس حکم کو خیر سمجھے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت دی جا رہی ہے کہ جو امیر کے کہنے پر خوشدلی سے اٹھ جائے گا تو اُسے اٹھا دیا جائے گا درجات کے اعتبار سے۔ یہ صنعتِ لفظی کا ایک خوبصورت انداز اور کلام کا ایک حسن ہے۔ یعنی امیر کے حکم پر اٹھ جانے والے کو اللہ تعالیٰ بلند درجات تک اٹھا دے گا۔
- غور فرمایئے کہ جو شخص کسی اجتماعی جِدّوجُہد میں شریک نہیں ہے تو قرآنِ مجید کی یہ باتیں اُسے کس طرح سمجھ میں آئیں گی؟ اُسے اِن باتوں کا علم تو ہو جائے گا لیکن اِن کی حقیقت

اور اِن میں پوشیدہ حکمتوں کا علم نہیں ہوگا جب تک وہ ایسی اجتماعیت میں شریک نہ ہو جو سمع و طاعت کے نظم کے ساتھ دینِ حق کے غلبے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔ اب اُسے احساس ہوگا کہ غلبہ دین کے لیے قائم کی گئی اجتماعیت کا تحفظ اور اُس کی مصلحتیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک کتنی اہم ہیں۔ اِس اجتماعیت کو انتشار سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ کتنی باریک بینی سے ہدایات دے رہا ہے۔

• آیت کے آخر میں ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ خوب باخبر ہے اُس سے جو تم کر رہے ہو۔ گویا اگر تم نے اوپر دی گئی ہدایات پر عمل نہ کیا تو پھر وہ تمہارا محاسبہ کرے گا۔

آیات ۱۲'۱۳

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا﴾ ''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو!'' ...... ﴿اِذَا نَاجَیۡتُمُ الرَّسُوۡلَ﴾ ''جب تم سرگوشی کرو رسولؐ سے'' ...... ﴿فَقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیۡ نَجۡوٰىکُمۡ صَدَقَةً﴾ ''تو پیش کرو اپنی سرگوشی سے پہلے صدقہ'' ...... ﴿ذٰلِکَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ وَاَطۡهَرُ﴾ ''یہ تمہارے لیے زیادہ اچھا اور زیادہ پاکیزہ ہے'' ...... ﴿فَاِنۡ لَّمۡ تَجِدُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۱۲﴾ ''پھر اگر تم نہ پاؤ (صدقے کے لیے کچھ) تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا' ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔ ﴿ءَاَشۡفَقۡتُمۡ اَنۡ تُقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیۡ نَجۡوٰىکُمۡ صَدَقٰتٍ﴾ ''کیا تم ڈر گئے کہ پیش کرو اپنی سرگوشی سے پہلے کچھ صدقے'' ...... ﴿فَاِذۡ لَمۡ تَفۡعَلُوۡا﴾ ''سو جب تم نے ایسا نہیں کیا'' ...... ﴿وَتَابَ اللّٰهُ عَلَیۡکُمۡ﴾ ''اور نظرِ کرم کی اللہ نے تم پر'' ...... ﴿فَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ﴾ ''تو قائم کرو نماز اور دو زکوٰۃ'' ...... ﴿وَاَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ﴾ ''اور اطاعت کرو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی'' ...... ﴿وَاللّٰهُ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۱۳﴾ ''اور اللہ خوب باخبر ہے اُس سے جو تم کر رہے ہو''۔

• منافقین علیحدگی میں یا مجلس میں آپ ﷺ کے قریب آ کر سرگوشی کرتے۔ اُن کا مقصد اپنی ذات کو نمایاں کرنا' اپنی بڑائی ظاہر کرنا اور لوگوں پر یہ تاثر دینا ہوتا تھا کہ اُن کے آپ ﷺ سے قریبی روابط ہیں۔ اُن کی اِس حرکت سے آپ ﷺ کا وقت ضائع ہوتا تھا اور آپ ﷺ کو ذہنی کوفت ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی شرارت کے سدِ باب کے لیے حکم دیا کہ جو شخص بھی آپ ﷺ سے تنہائی میں مشورہ یا خفیہ سرگوشی کرنا چاہے وہ پہلے اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ دے۔ یہ صدقہ دینا منافقین کے لیے بھاری ثابت ہوا اور وہ اپنی مذموم

حرکت سے باز آ گئے۔ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے صدقہ دینے کا یہ حکم منسوخ فرما دیا۔

• یہ اجتماعی زندگی کا بڑا اہم مسئلہ ہے جس کا ہر صاحبِ امر کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر مخلص مامور فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ اُسے صاحبِ امر سے قرب حاصل ہو اور اُس سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملے۔ البتہ اِس کا ایک منفی رخ بھی ہے۔ کچھ لوگ کام میں تو پیچھے ہوتے ہیں لیکن اپنی دولت یا وجاہتِ دُنیوی کی وجہ سے نمایاں ہونا چاہتے ہیں۔ اِس کے لیے وہ صاحبِ امر کے قریب ہو کر بیٹھتے ہیں اور اُس کے کان میں گفتگو کرتے ہیں تا کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ وہ صاحبِ امر سے خصوصی تعلقات رکھتے ہیں۔ اپنی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے بار بار صاحبِ امر سے علیحدگی میں گفتگو کے لیے وقت مانگتے ہیں۔ اِس روش کے تین نقصانات ہوتے ہیں:

(i) امیر کا وقت کسی مفید کام میں لگنے کے بجائے ضائع ہوتا ہے۔

(ii) اجتماعی مصالح اور بہبود کا کام متاثر ہوتا ہے۔

(iii) اگر کسی کے پاس واقعی کوئی اہم بات ہو تو وہ امیر تک پہنچنے سے رہ جاتی ہے یا اُس کے پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی ہے۔

دورِ نبوی ﷺ میں منافقین کی اِس حرکت کی روک تھام کے لیے ایک چھلنی لگا دی گئی کہ پہلے صدقہ دو اور پھر رسول اللہ ﷺ سے علیحدگی میں کوئی بات کرو۔ ساتھ ہی واضح کر دیا گیا کہ امیر سے علیحدگی میں سرگوشی کرنے کے لیے بلاوجہ یا خود کو نمایاں کرنے کے لیے وقت مانگنا منافقانہ طرزِ عمل ہے۔ گویا ہر دور میں مامورین کے لیے ہدایت ہے کہ وہ اِس منافقانہ طرزِ عمل سے اجتناب کریں۔

❁ ❁ ❁

تکبُّر

ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

اللہ تعالیٰ نے انسان کے ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح کے لیے شریعت اسلامیہ اور انبیاء ورُسل علیہم السلام کا سلسلہ جاری فرمایا ہے۔ انسانی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ باطن کی نسبت ظاہر پر توجہ زیادہ دیتی ہے اور باطن کی اصلاح کی بجائے ظاہر شریعت پر عمل ہی کو کُل دین سمجھ لیتی ہے۔ سابقہ مسلمان اقوام مثلاً یہود پر بھی ایک زمانہ ایسا آیا کہ وہ موسوی شریعت کے ظاہر میں اس قدر الجھے کہ اپنی باطنی اصلاح سے کلی طور پر غافل ہو گئے۔ اس زمانہ میں ان میں تورات کے بڑے بڑے فقہاء اور علماء تو موجود تھے اور ظاہر شریعت پر عمل بھی خوب ہو رہا تھا لیکن منکسر المزاجی‘ تواضع‘ انکساری‘ نرم دلی‘ خدا خوفی‘ للّٰہیت‘ خشیت‘ تقویٰ اور تقرب الی اللہ جیسے اوصافِ حسنہ مفقود تھے‘ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی باطنی اصلاح اور تزکیہ کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاصر انجیل میں موجود خطبات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے علمائے یہود کو اپنے باطن کی اصلاح اور تزکیہ نہ کرنے کی وجہ سے شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔

خیر القرون کے بعد امتِ مسلمہ کی اکثریت میں بھی باطن کی اصلاح یا تزکیہ نفس کی نسبت ظاہر شریعت یعنی فقہی مسائل اور ان پر عمل کی طرف توجہ زیادہ رہی ہے جس کی وجہ سے دین کا یہ اہم گوشہ نظر انداز ہوتا رہا ہے۔ کچھ طبقات نے اگر ہر دور میں اصلاحِ باطن کی طرف ’تصوف‘ کے نام توجہ دی بھی تو اس میں اصلاح کے شرعی منہج اور طریقہ کار کو نظر انداز کیا گیا اور اپنے ذاتی مشاہدات و تجربات کو اصلاحِ باطن اور تزکیہ کے نبوی طریق کار پر ترجیح دی گئی۔ اصلاحِ باطن اور تزکیہ نفس کا ایک اہم موضوع رذائل سے اپنے نفس اور باطن کو پاک کرنا ہے۔ رذائل

انسانیہ میں سے ایک اہم تر وصف تکبر ہے۔ تکبر سے ملتے جلتے کئی ایک رذائل کی کتاب وسنت میں نشان دہی کی گئی ہے‘ جو درج ذیل ہیں:

۱۔ کبر ۲۔ عُجب ۳۔ حُبِ جاہ ۴۔ حُبِ تفوق ۵۔ ریا

تکبّر

تکبّر کا معنی اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسرے کو حقیر جاننا ہے۔ کتاب وسنت میں تکبر کرنے والے کے لیے ’متکبر‘ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ متکبّرین کے بارے نصوص میں بہت شدید وعید آئی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

((لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ مِنْ کِبْرٍ)) (۱)

’’وہ شخص جنت میں داخل نہ ہو گا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی اپنی بڑائی ہو۔‘‘

تکبر کے بارے اس مضمون میں ہم نے تکبر کی حرمت اور شناعت پر نصوص کی کثرتِ نقل کی بجائے صالحین اور اہلِ علم کے اقوال کی روشنی میں اس باطنی مرض کا ایک تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے‘ تاکہ اس مرض کی تشخیص اور پہچان عام ہو سکے۔

تکبّر کی اقسام

اہلِ علم نے تکبّر کی تین بڑی اقسام بیان کی ہیں‘ جو درج ذیل ہیں:

۱۔ اللہ پر تکبّر کرنا: یعنی اللہ کے مقابلے میں اکڑنا‘ جیسا کہ فرعون نے اس تکبر کا اظہار کیا تھا اور ’’اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی‘‘ کا دعویٰ کیا تھا۔ تکبر کی یہ قسم دہریت کا لازمہ ہے۔ دہریہ یعنی اللہ کا منکر تکبر کی اس قسم میں لازماً مبتلا ہوتا ہے۔ عموماً دہریوں کی زبان سے یہ الفاظ سننے میں آتے ہیں کہ ہم نے اہل مذہب کے خدا کو اس دنیا سے نکال دیا ہے۔ یہ تکبر کی بدترین صورت ہے۔ جو مسلمان یا آسمانی مذاہب کے قائلین اللہ کے وجود کے بارے مشکوک ہو جاتے ہیں یا کسی وہم کا شکار ہو جاتے ہیں‘ وہ بھی اس تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ایسے پریشان خیالوں کی زبان پر آپ اکثر یہ جملے نوٹ کریں گے کہ پتا نہیں خدا ہے بھی یا نہیں؟ اگلی دنیا میں جزا وسزا ہے بھی یا نہیں؟ ہم نہ تو خدا کا اقرار کرتے ہیں اور نہ ہی انکار‘ وغیرہ ذلک۔

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الإیمان‘ باب تحریم الکبر وبیانہ۔

۲۔ اللہ کے رسول ﷺ پر تکبّر کرنا: یعنی حق کے معاملہ میں اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت نہ کرنا اور اکڑ جانا۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ کیا اچھے کپڑے یا نیا جوتا پہننا بھی تکبر میں داخل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے' اور جہاں تکبر کا معاملہ ہے تو وہ یہ ہے:

((اَلْکِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ))(۱)

''تکبر تو حق بات کو جھٹلا دینا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔''

تکبر کی اس قسم میں اعتقادی منافقین اور منکرین حدیث مبتلا ہوتے ہیں۔ ایسے حضرات کی زبانوں سے ایسے جملے بکثرت سننے کو ملیں گے کہ محمد ﷺ بھی تو ہمارے جیسے انسان ہیں' تو ان کی اتباع واطاعت کیوں؟ یا ہم بھی اللہ کے کلام کو ایسے ہی سمجھ سکتے ہیں جیسا کہ محمد ﷺ نے سمجھا ہے۔ یا محمد ﷺ کی قرآنی تفسیر وتشریحات تو عرب کے غیر متمدن معاشرے کے لیے تھیں نہ کہ ہماری آج کی متمدن اور مہذب دنیا کے لیے۔ یا محمد ﷺ کو قرآن سمجھنے کا جتنا حق حاصل تھا' اتنا ہمیں بھی حاصل ہے۔ وغیرہ ذلک۔

۳۔ اللہ کے بندوں پر تکبّر کرنا: یعنی کسی بھی وصف کے اعتبار سے دوسرے انسانوں کی نسبت اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور انہیں حقیر جاننا۔ صحیح مسلم کی مذکورہ بالا روایت میں ''غمط الناس'' کا معنی بعض اہلِ علم نے یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی کسی نعمت میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسروں کو اس نعمت میں حقیر جاننا ''غمط الناس'' ہے' جسے آپ ﷺ نے تکبر کہا ہے۔ انسانوں میں تکبر کی سب سے عام قسم یہی ہے۔

اللہ کے بندوں پر تکبر کی صورتیں

اسلامی معاشروں میں تکبر کی اس قسم کی بے شمار صورتیں پائی جاتی ہیں' جن میں سے چند ایک کی ہم نشان دہی کر رہے ہیں:

۱۔ مال کے ذریعے تکبّر کرنا: جو بادشاہوں' تاجروں اور مال داروں میں ہوتا ہے۔ اس صورت میں ایک مالدار شخص مال کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ جو مال دار بھی غریب کو حقیر جانے یعنی اس کے پاس بیٹھنے' یا اس کے ساتھ کھانے' یا اس کے ساتھ

(۱) صحیح مسلم' کتاب الإیمان' باب تحریم الکبر و بیانہ

چلنے' یا اس سے گفتگو کرنے' یا اس کے گھر جانے' یا اس کے محلے میں جانے' یا اس کے ساتھ دوستی کرنے میں ہچکچاہٹ اور حجاب محسوس کرے تو بلاشبہ وہ اس تکبر میں مبتلا ہے۔ عموماً مال دار دین دار گھرانوں میں بھی یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ وہ اس تکبر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایک دینی ادارے میں حفظ کی کلاس سے ایک مالدار دینی رجحان رکھنے والے خاندان نے اپنے بچے اس لیے اٹھا لیے کہ اس ادارے میں ان کے ملازمین کے بچے بھی ساتھ ہی حفظ کر رہے تھے۔ عام طور پر اس کا بہانہ یہ بنایا جاتا ہے کہ غرباء کے بچوں میں تہذیب نہیں ہوتی' حالانکہ اُمراء کے بچے جس قدر مہذب ہوتے ہیں اس کا ایک جائزہ بھی انگلش میڈیم سکول کے بچوں کی چال چلن کی رپورٹس سے خوب لگایا جا سکتا ہے۔ اصل میں یہ تکبر ہے جس کی وجہ سے اُمراء اپنے بچوں کو اپنے ملازمین یا غرباء کے بچوں کے ساتھ پڑھانے میں حجاب محسوس کرتے ہیں' ورنہ تو بچے سبھی فطرتِ سلیمہ پر ہوتے ہیں۔ جسے دینی ماحول مل جائے اس کی تربیت ہو جاتی ہے اور جسے نہ ملے وہ چاہے غریب کا بچہ ہو یا امیر کا' بگڑ جاتا ہے۔

۲۔ جمال کے ذریعے تکبر کرنا: جیسا کہ عموماً عورتوں میں ہوتا ہے۔ جب کوئی خاتون اللہ کی طرف سے عطا کیے گئے حسن پر اترائے اور دوسری خواتین کو اپنے سے کم تر سمجھے تو وہ تکبر کی اس قسم میں بلاشبہ مبتلا ہو چکی ہے۔ اس صورت میں حسین خاتون دوسری خواتین کے خدوخال یا رنگت یا پہننے اوڑھنے کے سلیقہ پر منفی تبصرے کرتی نظر آتی ہے کہ فلاں کو تو پہننے کا ڈھنگ ہی نہیں ہے' یا فلاں اپنی شکل وصورت میں بہت ہی سادی ہے' یا فلاں کے چہرے پر تو مسکینی ہی چھائی رہتی ہے' یا فلاں سٹائلش نہیں ہے۔ ایسے تمام تبصروں سے اگر تو حسین عورت کا مقصود اپنے آپ کو دوسری خواتین کے بالمقابل برتر سمجھنا یا ثابت کرنا ہو تو یہ تکبر ہے۔ اور اگر اس کے دل میں ان تبصروں کے وقت اپنے حسن کی بڑائی موجود نہ ہو تو یہ غیبت ہے' جو تکبر ہی کی طرح حرام ہے' اگرچہ حرمت میں اس کا گناہ تکبر سے کم ہے۔

۳۔ اپنے پیروکاروں کی کثرت کے ذریعے تکبّر کرنا: جیسا کہ علماء یا صوفیاء یا گدی نشینوں یا خطباء یا واعظین یا مذہبی وسیاسی جماعتوں یا انقلابی تحریکوں کے قائدین میں ہوتا ہے۔ تکبر کی اس صورت میں ایک شخص اپنے متبعین یا متاثرین کی کثرت کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ مثلاً جب کوئی بڑا خطیب یا مشہور واعظ دوسرے خطباء وواعظین پر یہ تبصرہ کرے کہ انہیں تو منبر پر کھڑا ہونا ہی نہیں آتا' یا انہیں تو پتا ہی نہیں تقریر کیسے

کرتے ہیں؟ یا فلاں خطیب تو بس جمعہ ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں‘ وغیرہ ذٰلک‘ تو یہ خطیب اور واعظ بھی بلاشبہ تکبر کے مرض میں مبتلا ہو چکا ہے۔ بعض اوقات متبعین اور متاثرین بھی اس تکبر میں مبتلا ہوتے ہیں‘ مثلاً کسی جماعت یا تحریک سے وابستہ کارکنان اپنی جماعت یا تحریک کے ممبران کی کثرت پر اتراتے نظر آتے ہیں‘ یا علماء‘ شیوخ‘ اساتذہ‘ صوفیاء اور مربیّن کے پیروکار اپنے عالم‘ پیر‘ شیخ‘ مربی اور استاذ کو دوسرے علماء‘ صوفیاء‘ شیوخ‘ مربیین اور اساتذہ کے مقابلے میں آسمان پر چڑھانے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو یہ حضرات اپنے شیخ‘ استاذ‘ پیر یا مربی کو دوسروں سے بالاتر قرار دیتے ہوئے دراصل یہ ثابت کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں کہ جب ہمارے شیخ اور استاذ تمہارے شیخ اور استاذ سے بہتر ہیں تو ہم ان شیوخ واساتذہ کے شاگرد دوسرے شیوخ واساتذہ کے شاگردوں سے بہتر ہیں۔

۴۔ اپنے علم پر تکبر کرنا: جیسا کہ بعض علماء میں یہ مرض پایا جاتا ہے۔ اس صورت میں ایک عالمِ دین اپنے علاوہ علماء کو اپنے سے حقیر سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو بڑا جانتا ہے۔ بعض شیوخ الحدیث‘ مفتیانِ کرام‘ کبار علماء اور محققین کو آپ دیکھیں گے کہ سائلین کے ساتھ بیٹھنا اپنے وقار کے منافی سمجھتے ہیں‘ یا طالبانِ دین اور نوجوان علماء کے ساتھ علمی تبادلہ خیال میں عار محسوس کرتے ہیں‘ یا کسی اَن پڑھ مخلص سائل کی رہنمائی کو اپنے وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں‘ یا دوسرے علماء کے دلائل پر اس لیے توجہ نہیں دیتے یا ان کی تحقیقات سے استفادہ نہیں کرتے کہ وہ علم میں ان کو اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ علمی تکبر کے اس دریا میں فقہی مسالک و مذاہب کے متبعین کی اکثریت سرتا پا غرق ہے۔ ایک مسلک کے نمائندہ علماء دوسرے مسالک و مذاہب کے علماء کو حقیر جانتے ہیں اور انتہائی اخلاص سے یہ تکبر اپنے دل میں پالتے رہتے ہیں کہ علمی اعتبار سے اس جہاں میں ہمارا کوئی ثانی نہیں ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ اگر کسی بڑے عالم دین‘ شیخ الحدیث یا مفتی صاحب کو مذہبی جلسہ وتقریب کے دوران سٹیج پر جگہ نہ ملے اور وہ عوام الناس کے ساتھ نیچے فرش پر بیٹھنے میں حجاب محسوس کریں تو یہ عالم دین‘ شیخ الحدیث اور مفتی صاحب علمی تکبر میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی عالم دین یا شیخ الحدیث یا مفتی صاحب کو مخاطب کرتے وقت اَلقابات کا لحاظ نہ کیا جائے اور براہ راست ان کا نام لے لیا جائے اور وہ اس کو برا جانیں تو بلاشبہ یہ بھی تکبر ہی کی ایک قسم ہے۔

اس بحث سے مقصودِ کلام یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں میں عام طور پر تکبر کی یہ صورتیں نہیں

ہوتی ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کو اپنے ہر ہر فعل اور عمل کا محاسبہ اور تجزیہ کرتے رہنا چاہیے کہ میرا یہ عمل کہیں میری باطنی نشوونما یا تزکیہ میں رکاوٹ تو نہیں بن رہا ہے۔

تکبر کے درجات

بعض اہل علم نے تکبر کے تین درجات بیان کیے ہیں:

۱۔ دل میں اپنی بڑائی ہو اور ظاہر میں تواضع وانکساری ہو۔ تکبر کا یہ درجہ انتہائی خطرناک ہے اور اس کا تجزیہ کرنا بھی انسان کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس درجہ میں تکبر صرف دل تک محدود رہتا ہے اور انسان کے عمل یا قول میں داخل نہیں ہوتا۔

۲۔ تکبر کا دوسرا درجہ دل کے بعد اپنے افعال واعمال میں تکبر کا اظہار کرنا ہے۔ مثلاً کوئی شخص مجالس‘ محافل‘ دوستوں‘ خاندان اور معاشرے میں اپنے عمل وفعل کے ذریعے اپنی بڑائی چاہے‘ جیسا کہ ہم نے سابقہ صفحات میں اس کی کئی ایک مثالیں بیان کی ہیں۔ حدیث میں تہبند یا شلوار کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانا عملی تکبر میں شامل کیا گیا ہے۔ گردن میں چادر ڈال کر دونوں کندھوں سے نیچے لٹکانا بھی پنجاب کے چوہدریوں میں عملی تکبر کی ایک صورت ہے۔ بعض اوقات جبّوں اور قبّوں کے ذریعے بھی عملاً اپنی بڑائی کا اظہار کیا جاتا ہے۔

۳۔ تکبر کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے دل اور عمل سے بڑھ کر اپنی زبان سے فخر کا اظہار کرے‘ مثلاً اپنے تزکیہ نفس یا نیک ہونے کے دعوے کرے۔ بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ باتوں باتوں میں ہر کسی کو اپنے تہجد گزار ہونے یا نیک ہونے یا بڑا عالم دین ہونے یا تعلیمی اَسناد کی تاریخ سنانے یا عظیم محقق ہونے یا فل پروفیسر ہونے یا دین کا عظیم خادم بتلانے کے لیے بے چین ومضطرب ہوتے ہیں۔ بلاشبہ اس قسم کے اقوال میں تکبر قولی کی واضح صورت جھلکتی نظر آتی ہے‘ اور اگر کسی شخص میں یہ عادت ہو تو اسے اپنی باطنی اصلاح کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

تکبّر کے اسباب

تکبر کیوں پیدا ہوتا ہے؟ یا اس کے اسباب کیا ہیں؟ تکبر کے اسباب میں سے اہل علم نے حسد‘ بغض‘ کینہ‘ عجب اور ریا کا تذکرہ کیا ہے۔ جب کوئی شخص مال‘ علم‘ حسن وجمال یا مقام ومرتبے میں دوسرے سے حسد محسوس کرتا ہے تو عموماً اس پر تکبر کے ذریعے بڑائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اسی طرح جب کوئی شخص کسی دوسرے سے اپنے دل میں بغض اور کینہ رکھتا ہے تو یہ بھی اس کے تکبر کا سبب بن جاتے ہیں۔ اپنے نفس کے عشق میں مبتلا ہونا یعنی خود پسندی اور عجب بھی تکبر کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے۔ اسی طرح ریا کاری بھی تکبر کے اسباب میں داخل ہے۔

تکبر کا علاج

اہل علم نے تکبر کے دو قسم کے علاج تجویز کیے ہیں‘ جو ذیل میں بیان کیے جا رہے ہیں:

علمی علاج: تکبر کا علمی علاج یوں کیا جا سکتا ہے کہ انسان جب اللہ کی دی ہوئی کسی نعمت یا صفت یا کمال پر اپنے نفس میں بڑائی محسوس کرے تو یہ سوچ بار بار پیدا کرے:

۱۔ میرے اندر کا یہ کمال حق سبحانہ وتعالیٰ کا پیدا کردہ ہے‘ یعنی عطائی ہے اور اس کے حصول میں میرا کوئی ذاتی عمل دخل نہیں ہے۔

۲۔ میں کسی ذاتی اہلیت کی بنا پر اس نعمتِ خداوندی کا مستحق نہیں تھا‘ لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ کمال عطا فرما کر مجھے اپنی رحمت سے نوازا ہے۔

۳۔ اس کمال کے اللہ کی طرف سے عطا کیے جانے کے بعد اس کا بقاء میرے اختیار اور بس میں نہیں ہے اور کسی بھی وقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ اسے سلب کر سکتے ہیں۔

۴۔ اگرچہ دوسرے شخص میں یہ کمال فی الحال نہیں ہے لیکن ممکن ہے مستقبل قریب یا بعید میں اسے یہ کمال مجھ سے بھی زائد درجہ میں حاصل ہو جائے۔

۵۔ اس کا بھی غالب امکان ہے کہ دوسرے شخص میں کچھ ایسے کمالات ہوں جو میری نظر سے مخفی ہوں اور ان کی بنا پر اس کا رتبہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں مجھ سے زائد ہو۔

عملی علاج: تکبر کا عملی اور بہترین علاج یہ ہے کہ انسان جس کو اپنے نفس سے چھوٹا سمجھے‘ اس کے ساتھ بیٹھے‘ کھائے‘ پیے‘ گفتگو کرے‘ دوستی کرے‘ اس کا احترام کرے‘ اس کے بارے میں تحسین کے کلمات کہے اور اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے۔ مثلاً ایک امیر اپنے تکبر کو غرباء میں بیٹھ کر اور ایک عالم دین اپنے تکبر کو طلبہ میں بیٹھ کر دور کر سکتا ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ اہلِ علم نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ شریعت میں ازالہ نہیں بلکہ امالہ ہے۔ یعنی معصیت کا مادّہ ہی انسان سے ختم ہو جائے تو یہ شریعت کا مطالبہ نہیں ہے‘ بلکہ

شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان معصیت کے تقاضوں پر عمل نہ کرے اور ان کو کنٹرول کرے۔ پس تکبر کا مادہ ختم کرنا مقصود نہیں ہے‘ بلکہ تکبر کے تقاضوں پر عمل نہ کرنا اور اس بیماری کا علاج کرنا مقصودِ شرع ہے۔

تکبرّ سے متعلقہ بعض دوسری اصطلاحات

مضمون کے شروع میں ہم نے تکبر سے متعلق بعض دوسری اصطلاحات کا تذکرہ کیا تھا‘ ان کا ایک مختصر تعارف ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں تا کہ تکبر کے علاوہ ان باطنی بیماریوں کی پہچان بھی سالکین کے لیے آسان ہو۔

عُجب: اس سے مراد اپنے کو بڑا سمجھنا ہے۔ اس میں دوسری قید شامل نہیں ہے‘ یعنی دوسرے کو حقیر سمجھنا۔ اسے خود بینی یا خود پسندی کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ یعنی اپنے نفس کو ہی دیکھتے رہنا یا اپنے نفس ہی کے عشق میں مبتلا ہو جانا۔ گویا ع ’’اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں!‘‘ قرآن میں خود پسند کے لیے ’مختال‘ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

حُبِ جاہ: بلند مرتبے‘ منصب اور قدر و منزلت کی خواہش رکھنا۔ اپنے منصب کے اعتبار سے اپنے آپ کو دل ہی دل میں بڑا سمجھنا اور اس کی خواہش اور کوشش کرنا کہ دوسرے بھی مجھے عالی مرتبت سمجھیں۔

حُبِ تفوق: دوسروں پر غالب آنے کی شدید خواہش رکھنا اور اس پر عمل کرنا حب تفوق کہلاتا ہے۔ مشہور فلسفی ’ایڈلر‘ نے اس بارے میں 'urge to dominate' کے نام سے ایک پورا فلسفہ متعارف کروایا ہے۔

ریا: کسی دینی عمل کو لوگوں کی نظر میں بڑا بننے کا ذریعہ بنانا ریا کاری کہلاتا ہے۔

تکبر سے متعلق ان اصطلاحات میں سے ہر ایک مستقل مضمون کی متقاضی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس موذی مرض سے بچنے اور لگ جانے کی صورت میں اس کا علاج کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! ❀❀❀

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

کم سِنی کی شادی
مشرقی و مغربی تہذیب کے تناظر میں

اجود صدیقی ☆

برنارڈ شا نے کہا تھا کہ ’’دنیا کے کسی موضوع پر اتنی خرافات نہیں لکھی گئیں جتنی شادی کے مسئلہ پر لکھی گئی ہیں‘‘۔ چناں چہ اس مسئلے پر قلم اٹھاتے ہوئے ایک حجاب سا محسوس ہو رہا ہے‘ مگر ضروری نہیں کہ جس مسئلہ پر لوگوں نے خرافات کا انبار لگا دیا ہو اُس پر کوئی معقول بات نہ کی جا سکے۔ بلکہ ایک زاویۂ نگاہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس موضوع پر لوگوں نے خرافات جمع کر رکھی ہوں‘ وہی موضوع اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اُس پر معقولیت اور منطقیت کے ساتھ بحث کی جائے اور حق و باطل میں امتیاز کو واضح کیا جائے۔

عنوان کی تحدید

سب سے پہلے ہم اس عنوان ’’کم سنی کی شادی‘‘ پر کچھ کہنا چاہیں گے۔ لفظ کم سنی ایک اضافی و نسبتی اصطلاح (relative terminology) ہے۔ ہر معاشرے‘ سماج‘ ملک و علاقے کی نسبت سے کم سنی کے معنی معین ہوتے ہیں‘ جیسے مشرقی ممالک میں کم سنی کا اگر تعین کیا جائے تو شاید بحث ۸ سال سے لے کر ۱۲ سال تک کی عمر کو محیط ہو‘ اور اگر مغربی ممالک میں کم سنی (underage) پر بات ہو تو اوسطاً ۲۵ سے ۳۰ سال کی عمر مراد ہوگی۔ ہمارے خیال میں اس عنوان یعنی کم سنی کی شادی (underage marriages) کی تحدید کسی اضافت کے ساتھ ضروری ہے‘ مثلاً ’’مغربی معاشروں میں‘‘، ’’مشرقی معاشروں میں‘‘، ’’فطری عمر یعنی جسمانی بلوغت کے اعتبار سے‘‘، ’’اسلامی نقطۂ نگاہ سے‘‘، ’’طبی نقطۂ نگاہ سے‘‘ وغیرہ۔ فی الحال موضوع چوں کہ مطلق دیا گیا ہے اس لیے ہم اس پر تہذیبی جہت سے روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

☆ajwadsiddique@gmail.com

کیا یہ ایک واقعی مسئلہ ہے

سب سے پہلے تو یہ سوال اٹھتا ہے کہ یہ طرزِ فکر کہ ’’کم سنی کی شادی کوئی مسئلہ ہے‘‘ کیا واقعی ہماری اپنی تہذیب اور ثقافت یا مذہب اور عقائد سے متعلق ہے؟ یا مغربی معاشروں میں پروردہ چند خارجی نظریات کے ردّعمل میں سر اٹھا رہا ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ طرزِ فکر کُل کا کُل ایک انفعالی اور ردّعمل کی نفسیات کا غماز ہے۔ ورنہ اگر علاحدہ سے مشاہدہ کیا جائے تو مشرقی معاشروں میں کم سِنی کی شادی کبھی کوئی مسئلہ ہی نہیں رہی۔

مشرقی اور مغربی تہذیب کا فرق

مشرقی‘ روایتی اور مذہبی معاشروں میں شادی کے فیصلے میں حتمی اور فیصلہ کُن کردار ہمیشہ سے خاندان کے بزرگوں کا رہا ہے‘ چاہے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے والے دو افراد ’کم سن‘ ہوں یا شعور کی منزلیں طے کر چکے ہوں۔ اس تناظر میں یہ بات بہت واضح ہے کہ کم سنی کی شادی کے جو مبیّنہ مفاسد ہو سکتے تھے وہ ویسے ہی زیرِ بحث نہیں آتے۔ اس لیے کہ فیصلہ کرنے والے کم سن نہیں بلکہ جہاں دیدہ‘ ذی شعور‘ تجربہ کار اور بزرگ ہوا کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر مغربی معاشرت کے تناظر میں دیکھا جائے تو اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے والے افراد کیا اپنے بارے میں اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے اہل بھی ہیں یا نہیں؟ اُنہیں وہ فکری بلوغت حاصل ہے بھی کہ نہیں جو اس اہم اقدام میں اُن کے مستقبل میں آسودگی کی ضامن ہو سکے؟ یہی وہ بنیادی تہذیبی و ثقافتی فرق ہے جو اس سوال یعنی ’’کم سنی کی شادی؟‘‘ کو جنم دیتا ہے۔ مغربی معاشروں میں سنِ بلوغ (adult-hood) کی ایک قانونی عمر (نہ کہ طبی و جسمانی عمر) متعین کی جاتی ہے اور اُس کے بعد لڑکا یا لڑکی اپنے بارے میں مکمل خود مختار ہوتے ہیں۔ جو چاہیں وہ فیصلہ کریں‘ والدین یا دیگر بزرگ اُن کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کر سکتے۔ اس مقدمے کو مان لینے کے بعد یہ ایک اہم معاملہ ہے کہ کسی لڑکے یا لڑکی کو کم سنی میں شادی کا اختیار نہیں اور نہ ہی اُن کے والدین اس طرح کی کوئی پیش بندی کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔

دراصل یہ مغرب کا ایک خود ساختہ مقدمہ ہے‘ جس کے ذریعہ فرد کی مبیّنہ آزادی کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے یہ مقدمہ اپنی اصل کے اعتبار سے مشرقی اور مذہبی معاشروں میں کبھی قبول نہیں کیا گیا۔ چنانچہ اس کے مان لینے کے بعد جو مسائل جنم لیتے ہیں وہ بھی مشرقی اور مذہبی معاشروں کے حقیقی مسائل (geniune problems) نہیں رہے‘ بلکہ مغربی معاشروں کی نقالی

میں جب ہمارے ممالک میں غیر ریاستی اداروں (NGO's) کا چلن عام ہوا تو بہت سے عنوانات سے کانفرنسوں کا انعقاد فیشن بن گیا‘ مثلاً تعددِ ازدواج (polygamy)‘ حقوقِ نسواں (women rights)‘ حقوقِ انسانی (human rights)‘ کم سنی کی شادی (underage marriages)‘ بچہ مزدوری (child labour)‘ شرح خواندگی (literacy rate)‘ آزادیٔ اظہار (freedom of speach)‘ وعلیٰ ھذا القیاس‘ بہت سے مزید موضوعات جو اصلاً ایک اجنبی مسافر کی مانند ہمارے گلی کوچوں میں حیران وسرگرداں گھومتے ہوئے آوارہ نظر آتے ہیں ‘یا یوں کہیے کہ ولایتی پودے کو دیسی زمین میں لگا کر رس اور خوشبو سے بھرپور فصل کا انتظار کرنے والے نادان باغباں کی مانند یہ قوم بھی کسی موہومہ ترقی کی آرزومند ہے۔

اک نظر مغربی ’’ترقی‘‘ پر

یہاں ایک نظر مغربی معاشرے کی اُس ’’ترقی‘‘ پر ڈالنا بھی مفید رہے گا‘ جو آج ہمارے مغرب گزیدہ طبقے کی جنتِ گم گشتہ ہے۔ زمانۂ حال کے ایک امریکی فلسفی اور فلسفہ سماجیات کے ماہر وِل ڈیورانٹ (Will Durant) (۱۸۸۵۔۱۹۸۱ء) اپنی شاہکار تالیف ’’نشاطِ فلسفہ‘‘ (The Pleasure of Philosophy) میں ’’شادی کی شکست‘‘ کے عنوان سے ایک باب قائم کر کے اُس کے تحت لکھتے ہیں:

’’......آج یہ ادارہ چھینا جھپٹی اور کاروبار کا ایک عجیب امتزاج بن گیا ہے۔‘‘

’’مرد کے وحشی جذبات میں نرمی پیدا ہوئی اور صدیوں کے ارتقاء کے بعد جسم کے لیے جسم کی ہوس رومانی محبت میں تبدیل ہوگئی۔‘‘

وہ آگے چل کر ’’شادی کا تنزل‘‘ عنوان قائم کرتے ہیں اور مغربی معاشروں میں اس مقدس ادارے کی حالتِ زار کا نقشہ کچھ یوں کھینچتے ہیں:

’’اب مَرد دولت مند ہے اور شادی مرگِ محبت کی رسم ادا کرتی ہے۔‘‘

’’ان کا پیمان کوئی مقدس پیمان نہیں ہوتا بلکہ ایک کاروباری معاہدہ ہے جسے وہ جب چاہیں توڑ سکتے ہیں۔‘‘

مندرجہ بالا الفاظ پر غالب کا یہ شعر یاد آ گیا: ؎

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے!

حل: ’’شادی کی تعمیرِ نو‘‘

’’عورت مایوس ہو جاتی ہے‘ وہ اس چار دیواری کو خوش گوار بنانے کی کوئی سبیل نہیں پیدا کرسکتی اور کسی نہ کسی بہانے وہ اس سے فرار اختیار کرتی ہے اور صبح کے وقت اس میں واپس آتی ہے۔ مرد مایوس ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ دن بھر کی مشقت کے بعد اس میں گھر کا سا آرام اور اطمینان نہیں پاتا۔ آہستہ آہستہ اسے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ کمرے بالکل ایسے ہی ہیں جیسے کبھی اُس کے غیر شادی شدہ زمانے میں ہوا کرتے تھے اور یہ کہ اُس کے اپنی بیوی سے روابط بالکل اُسی طرح بے کیف ہیں جس طرح کبھی سہل الحصول عورتوں کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ شادی سے کوئی نئی بات پیدا نہیں ہوئی‘ بچے کی آواز رات کی نیند میں مخل نہیں ہوتی‘ بچے کے کھیل کود دن کو درخشاں نہیں بناتے‘ بچے اپنے گداز بازوؤں سے خیر مقدم کر کے دن کی محنت اور مشقت کی تکان کو دور نہیں کرتے...... وہ سوچتے ہیں کہ احتیاط بہتر ہے‘ وہ یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ بچے پیدا نہیں کریں گے اور اسی حال میں وہ علاحدہ ہو جاتے ہیں۔‘‘

وِل ڈیورانٹ نے آگے چل کر ’’شادی کی تعمیرِ نو‘‘ کے عنوان کے تحت اس بگاڑ کا حل وہی تجویز کیا ہے جو آج ہمارے معاشروں میں مصنوعی طور پر ایک مسئلے کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے اور یہی وہ مناسبت ہے جس کی بنا پر ہم نے یہ اقتباسات یہاں پیش کیے ہیں۔

’’اس کے علاج میں سب سے زیادہ تعمیری عنصر یہ ہے کہ شادی کی اوائل شباب میں ترغیب دی جائے اور یہی ہمارے اخلاقی مسئلہ کی جان (حل) ہے۔ اگر ہم کسی طرح شادی کی فطری عمر کو بحال کر سکیں تو عصمت فروشی‘ خفیہ امراض‘ جنسی بے راہ روی میں فوراً خاصی تخفیف ہو جائے۔‘‘

’’ہم شادی کے عظیم تجربہ سے گریز کرتے ہیں اور محبت کو ختم کر دیتے ہیں۔ ابتدائی شباب کی محبت تازہ اور گہری ہوتی ہے۔ تیس برس کی عمر کے بعد کوئی مرد جوانی کے جوش اور سپردگی کے ساتھ محبت نہیں کرسکتا۔ پہلی محبت روح میں جو سپردگی پیدا کرتی ہے وہ ایک برس کے اختلاط اور آزمائش سے ختم نہیں ہوتی۔ لڑکے کی معصوم ہوس اور لڑکی کا بے باک اعتماد زندگی کو ہمیشہ خوش گوار رکھے گا۔‘‘

بعد ازیں شادی کے التوا میں ایک کثیر الوقوع سبب یعنی ’’معاشی عدم استحکام‘‘ پر بات کرتے ہوئے وِل ڈیورانٹ تجویز کرتے ہیں:

''ہمیں والدین کو یہ سمجھانا چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کی شادی کو ملتوی کر کے اُن میں جنسی بے راہ روی پیدا کر رہے ہیں اور حکمت اسی میں ہے کہ صحت مند نوجوانوں کی شادی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے بلکہ بیٹیوں اور بیٹوں کے لیے اچھی خاصی مالی امداد مہیا کی جائے تا کہ اُن کی اقتصادی ناپختگی دور ہو اور اُن میں زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی طاقت بڑھے۔ یہ امداد قرضِ حسنہ کی حیثیت رکھے گی جو بچے اگلی نسل کو ادا کر دیں گے۔ اس میں کوئی نقصان نہیں' ہر شخص فائدے میں رہے گا۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ جب والدین اس قسم کی فراخ دلی سے کام لیا کرتے تھے۔''

زنورِ مصطفیٰ ﷺ او را بہا است

مندرجہ بالا سطور میں عہد حاضر کے ایک فاضل فلسفی کی آراء پیش کی گئیں جو ایک ماہر طبیب کی مانند مغرب کے بیمار معاشرے اور سماج کے مرض کی صحیح صحیح تشخیص بھی کرتا ہے اور پھر تیر بہ ہدف نسخہ شفا بھی تجویز کرتا ہے۔ ہمارے قیاس میں وِل ڈیورانٹ کی یہ بصیرت نورِ مصطفیٰ ﷺ سے مستعار ہے' جیسے کہ وِل کی دیگر کتب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے' مثلاً اسلامی تہذیب کی داستان (Story of Civilization, Volume: Age of Faith, Islamic Civilization)

جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا: ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
زاں کہ از خاکش بروید آرزو
یا زنورِ مصطفیٰؐ او را بہا است
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

اسی وِل ڈیورانٹ نے' جس کے اقتباسات ہم نے "شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا" کے مصداق سطورِ بالا میں درج کیے' اپنی محولہ بالا کتاب میں رسولِ خدا ﷺ کے بارے میں مندرجہ ذیل الفاظ رقم کیے ہیں' جن سے ہمارے مذکورہ قیاس کو تقویت ملتی ہے:

''اگر ہم تاریخ پر اثرات کے حوالہ سے تجزیہ کریں تو محمد (ﷺ) کا کوئی ثانی نہیں۔ محمد (ﷺ) نے جاہلیت کی دلدل میں دھنسے ہوئے لوگوں کو روحانی اور اخلاقی رفعت سے ہم کنار کیا اور کسی بھی دوسرے مصلح یا پیغمبر کی نسبت زیادہ کامیاب رہے۔''

حاصلِ کلام

گزشتہ گفتگو سے ہم ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ کم سنی کی شادی مغربی تہذیب کے زیر اثر پیدا ہونے والا ایک مسئلہ ہے۔ اسلامی تہذیب ایک مکمل اکائی ہے جس میں اگر کم سنی کی شادی کی اجازت دی گئی ہے تو کُل سے علاحدہ کر کے نہیں' بلکہ اُس مکمل معاشرتی پس منظر میں' اخلاقی تناظر میں' تہذیبی روایات کے ساتھ اور سب سے بڑھ کر اُن پیمانوں میں ڈھال کر جو وحی و رسالت کے ہاتھوں متعین ہوئے ہیں۔ چناں چہ آج کے معاشرے میں اگر کم سنی کی شادی شر اور ظلم کا باعث بن رہی ہے یا کسی بگاڑ کا ذریعہ ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ اسلامی تعلیمات میں کوئی نقص ہے' جسے مغربی اَفکار کے تناظر میں درست کرنے کی ضرورت ہے' بلکہ یہ شر اور فساد اصلاً اسلام کی تعلیمات کو اَجزاء میں بانٹنے اور کچھ پر عمل کرنے اور کچھ میں مغرب کی نقالی کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کا علاج بھی یہی ہو سکتا ہے کہ مسلم معاشروں کی اصلاح کی جائے اور اس تناقض کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

آج ہمارے دانش ور طبقے کا یہی وہ المیہ ہے جس کی بنا پر مسلم معاشرے شدید دو قطبی تقسیم (polarization) کا شکار ہیں اور باہمی انتشار سے دوچار ہو رہے ہیں۔ سمجھنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ مسلم معاشروں میں اصلاح کے کام کے واحد معنی یہ ہیں کہ اُنہیں واپس اپنی اصل کی جانب گامزن کر دیا جائے' اور یہ اصل اُسوۂ محمد ﷺ کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اور

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

❀❀❀

تیسری عید؟

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

رسول اللہ ﷺ الرفیق الاعلیٰ کی طرف مراجعت کرنے سے قبل دین اسلام اکمل صورت میں امت کے حوالے کر گئے اور دین میں کسی طرح کی کمی بیشی کا دروازہ یہ کہہ کر بند کر دیا کہ ((مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ)) (متفق علیہ) ''جس شخص نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات پیدا کی جو اس میں نہیں تو وہ نامقبول ہے''۔ اسی لیے دین میں کسی طرح کا اضافہ بدعت کہلاتا ہے۔ پس ایسا کام کرنا جس کی اصل کتاب و سنت اور قرون مشہود لہا بالخیر میں نہ ہو اور اس کو دین اور ثواب کا کام سمجھ کر کیا جائے بدعت کہلاتا ہے۔ دین اسلام کی تکمیل پر اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر مہر لگا دی کہ ﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ﴾ (المائدۃ:۳) ''آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے''۔ مکمل چیز میں کسی کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ پھر جس چیز کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ مکمل کر دے اس میں تو کسی اضافے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

جو دین کامل صورت میں رسول اللہ ﷺ اُمت کے حوالے کر گئے اس میں عیدیں دو تھیں۔ آج تیسری عید کا اضافہ دین کے مزاج کے خلاف ہے۔ انبیاء کرام ؑ کی پیدائش یا وفات کے دن منانے کی کوئی نظیر سنت میں نہیں ملتی۔ یقیناً رسول اللہ ﷺ کی پیدائش کا دن خوشی کا دن ہے اور وفات کا دن غمی کا دن ہے، مگر یہ دن آپ ﷺ کی مکی زندگی میں بھی ہر سال آتے رہے اور مدنی زندگی میں بھی۔ مگر آپؐ نے نہ یہ دن منائے اور نہ اُمت کو حکم دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کے بعد آپؐ کے خلفائے راشدینؓ کے دور میں بھی یہ دن نہ منائے گئے۔ خلفائے راشدین رسول اللہ ﷺ کے صحیح پیروکار اور پکے سچے مسلمان تھے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَعَلَیْكُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَهْدِیِّیْنَ)) (ابوداؤد، ترمذی) ''پس تمہارے لیے لازم ہے کہ میرا طریقہ اختیار کرو اور میرے ہدایت یافتہ، راست رو خلفاء کا طریقہ

اختیار کرو''۔

چونکہ تیسری عید نہ عہدِ رسالت میں تھی، نہ خلفائے راشدین کے دور میں، اس لیے اس کے منانے کا طریقہ بھی متفق علیہ نہیں ہے۔ کوئی جلوس نکال رہا ہے اور نعرے لگا رہا ہے، کوئی گھروں اور مسجدوں کو جھنڈیوں اور روشنیوں سے سجا رہا ہے، کوئی راہ گیروں سے چندہ مانگ کر گلیوں بازاروں میں پہاڑیاں بنا رہا ہے۔ اس دن کے جلوسوں کی قیادت علمائے دین کر رہے ہیں، جبکہ ان کے اندر خلافِ شریعت کام بھی ہو رہے ہیں، مثلاً جلوس کی بڑائی ثابت کرنے کے لیے راستے روکے جا رہے ہیں اور آنے جانے والوں کے لیے مشکل پیدا کی جا رہی ہے۔ کیا یہ علماء نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان نہیں جانتے کہ ((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ)) (متفق علیہ) ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں؟'' اگر حضور ﷺ کے ساتھ محبت کا یہ انداز ہے تو کیا خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ ؓ حُبِّ نبی ﷺ سے خالی تھے؟ نعوذ باللہ! صاف ظاہر ہے حُبِّ نبیؐ جتانے کا یہ مظاہرہ ہوائے نفس کے سوا کچھ نہیں۔ حقیقی اور خالص حُبِّ نبویؐ تو صحابہ کرام ؓ کو تھی جنہوں نے عملی طور پر رسول اللہ ﷺ کے فرامین پر عمل کر کے دکھایا اور اپنی کسی پسند یا ناپسند کو دین میں داخل نہ کیا۔ جو عیدیں اسلام میں داخل ہیں ان کے پروگرام متفق علیہ ہیں، اُن میں کوئی اختلاف نہیں، مگر یہ تیسری عید جب اسلام میں نہیں تو اس کا پروگرام بھی دین میں نہیں بتایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ منانے والے اپنی مرضی کے پروگرام بنا رہے ہیں، موسیقی اور ناچ گانے بھی ہو رہے ہیں۔

خوشی اور غمی کے دن منانا اسلام میں نہیں۔ بدر کی فتح کے دن کو قرآن میں ''یوم الفرقان'' کہا گیا۔ یہ دن نبی مکرم ﷺ کے حینِ حیات آٹھ سال تک ہر سال آتا رہا مگر کوئی تقریب نہ منعقد کی گئی۔ اسی طرح دوسرے غزوات میں کامیابی، صلح حدیبیہ اور فتح مکہ بہت بڑے واقعات تھے مگر ان کی یادوں کے دن نہیں منائے گئے۔ حضور ﷺ کے دندانِ مبارک کی شہادت کا دن اور طائف میں آپؐ کے ساتھ اذیت ناک سلوک، حضرت حمزہ ؓ کی شہادت کا دردناک واقعہ۔ ان واقعات کے دنوں میں سوگ منانے کو رواج نہیں دیا گیا۔ وجہ یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں خوشی اور غمی کے مواقع ناگزیر ہیں۔ ان کی اتنی کثرت ہے کہ ان کو خوشی یا غمی کے تہوار کے طور پر منانا ممکن ہی نہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿لِّكَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَاۤ اٰتٰىكُمْ﴾ (الحدید:۲۳) ''تاکہ تم رنجیدہ نہ ہو اس چیز پر جو تم سے جاتی

رہے اور نہ ہی اتراؤ اس چیز پر جو تم کو عطا ہو۔‘‘

قرآن وحدیث کا فہم نہ رکھنے والوں پر کیا افسوس! افسوس ان علمائے کرام پر ہے جو اس عید کو نہ صرف اپنے بنائے ہوئے طریقوں سے اپناتے ہیں' بلکہ اسے قرآن سے بایں طور ثابت کرتے ہیں: ﴿قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا ...... ﴾ (المائدۃ:۱۱۴) ’’عیسیٰ بن مریم نے کہا: اے اللہ' رب ہمارے! اتار ہم پر خوان بھرا ہوا آسمان سے کہ وہ دن ہمارے لیے عید رہے......‘‘ اگر اس آیت سے تیسری عید ثابت ہوتی ہے تو خود رسول اللہ ﷺ نے یہ عید کیوں نہ منائی اور اپنی امت کو اس کے منانے کا حکم کیوں نہ دیا؟ کیا آج کے یہ علماء قرآن حکیم کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ سمجھتے ہیں؟ یار لوگوں کا کیا کہنا' انہوں نے تو غیر اللہ کو سجدہ کرنے کا جواز بھی قرآن سے ڈھونڈ لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا تو کیا آدمؑ غیر اللہ نہ تھا؟ پس (اُن کے نزدیک) غیر اللہ کو سجدہ قرآن سے ثابت ہو گیا! (لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ)۔ سورۃ الکہف میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک بندے نے موسیٰ علیہ السلام کو ان باتوں کی خبر دی جو وہ نہیں جانتے تھے۔ پس (ان کے نزدیک) ثابت ہوا کہ غیر نبی نبی اللہ سے زیادہ فضیلت رکھ سکتا ہے! اسی طرح میں نے ایک پڑھے لکھے شخص سے پوچھا: دوست! آپ لوگ روتے پیٹتے کیوں ہیں؟ وہ کہنے لگا: واہ آپ نے قرآن نہیں پڑھا؟ میں نے کہا: کچھ تو پڑھا ہے۔ وہ کہنے لگا: (سورۃ الفاتحہ کے بعد) قرآن کا تو آغاز ہی ’’الٓمّٓ‘‘ سے ہوتا ہے۔ ان حروفِ مقطعات ’’الٓمّٓ‘‘ کو جوڑیں تو ’’الم‘‘ بنتا ہے جس کا معنی ہے دکھ' درد' رنج۔ ہمارا تو قرآن ہی الم سے شروع ہوتا ہے۔ اگر سمجھنے کا یہی انداز ہے تو قرآن سے ہر چیز ثابت ہو سکتی ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ’’سو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ پیروی کرتے ہیں متشابہات کی گمراہی پھیلانے کی غرض سے اور مطلب معلوم کرنے کی وجہ سے' اور ان (متشابہات) کا حقیقی مفہوم کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے۔‘‘ (آل عمران:۷)

کہا جاتا ہے کہ قرآن کے اعراب بھی بعد میں لگائے گئے۔ جان لینا چاہیے کہ یہ وقت کی ضرورت تھی' کیونکہ اعراب کے بغیر غیر عرب قومیں نہ قرآن کو پڑھ سکتی تھیں نہ سمجھ سکتی تھیں۔ کیا حُبِ نبی ﷺ کی بھی اب ضرورت پڑی ہے جو یہ عید ایجاد کرنا پڑی؟ اس تیسری عید کی ایجاد سے پہلے مسلمان حُبِ نبی ﷺ سے بے خبر تھے؟ تیسری عید کے جواز میں خوابوں کا سہارا بھی لیا

جاتا ہے۔ عوام تو ناواقف سہی لیکن کیا یہ علماء بھی نہیں جانتے کہ کسی بڑے سے بڑے آدمی کے خواب سے اُمت کے لیے کوئی حکم وضع نہیں کیا جا سکتا؟ محفل میلاد میں ایک شخص یہ اعلان کرتا ہے کہ دیکھو حضور ﷺ تشریف لے آئے ہیں! یہ سنتے ہی سب بیٹھے ہوئے لوگ تعظیماً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیا مسلمان شرکاءِ محفل یہ نہیں جانتے کہ حضور ﷺ نے حینِ حیات اس بات کو پسند نہیں فرمایا کہ آپؐ تشریف لائیں تو لوگ کھڑے ہو جائیں' بلکہ آپؐ نے اس بات سے منع فرما دیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ذکر ہوا کہ تمہارے لیے لازم ہے کہ میرا طریقہ اختیار کرو اور میرے ہدایات یافتہ راست رو خلفاء کا طریقہ اختیار کرو۔ چونکہ تیسری عید نہ آپؐ کے طریقہ میں تھی نہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور میں تھی' لہٰذا اس کا پروگرام بھی لوگوں کا اپنا بنایا ہوا ہے۔ اس میں طرح طرح کی تکلیف دہ چیزیں اور منکرات ہوتے ہیں' جن کو علماء جانتے بوجھتے روک نہیں سکتے' کیونکہ اس طرح شرکاء ناراض ہوتے ہیں' مثلاً جلوس کا راستے بند کر کے مسافروں کے لیے تکلیف کا باعث بننا۔ لہٰذا وہ خدا اور رسول کے حکم کی نافرمانی بادلِ نخواستہ قبول کر لیتے ہیں اور لوگوں کو نہیں روکتے۔ انہیں ضرور پتا ہوتا ہے کہ حجر اسود کا بوسہ لینے میں کسی دوسرے کو دھکا دینا جائز نہیں تو اور کس جگہ جائز ہے کہ دوسروں کو تکلیف میں مبتلا کیا جائے؟ فقہ کے چار معروف امام ہیں' ہر ایک کے ہاں دو ہی عیدیں ہیں' عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔ تیسری عید کا کوئی تذکرہ نہیں۔ بالفرض اگر کوئی دوسرا شخص اس کا حکم دیتا ہے تو وہ اس بات کا مجاز نہیں کہ حضور ﷺ کی اُمت کو کسی تیسری عید کا پابند کرے۔ اُمت تو بس قرآن وسنت اور خلفائے راشدینؓ کے طریقے کی پابند ہے' کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا:

> ’’جو کوئی تم میں سے میرے بعد زندہ رہے گا وہ عنقریب بہت سے اختلاف دیکھے گا۔ پس تم پر میری اور میرے ہدایت یافتہ راست رو خلفاء کے طریقے کی پیروی لازم ہے۔ اس کے ساتھ چمٹ جاؤ اور اسے اپنے دانتوں سے مضبوطی سے پکڑے رہنا اور نئے نئے کاموں سے بچتے رہنا' کیونکہ ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔‘‘

اس عید کے منانے میں جوش وخروش دکھانے والے اگر رسول اللہ ﷺ کی محبت میں سچے ہیں تو معاشرہ گناہوں سے پاک کیوں نہیں ہو جاتا۔ آپؐ سے محبت رکھنے والے گناہوں پر دلیر کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہم دیکھتے ہیں معاشرے میں جرائم تو بڑھتے جا رہے ہیں۔ حب

نبی ﷺ کا یہ طریقہ اپنا کر مسلمان سمجھتا ہے کہ اس نے نبی مکرم ﷺ کو خوش کر لیا ہے۔ اب اسے کوئی گناہ نقصان نہیں دے گا!

اگر تیسری عید قرآن سے ثابت ہے تو یہ بات حضور ﷺ کی نگاہ سے کیوں اوجھل رہی؟ آپ ﷺ پر تو قرآن نازل ہوتا تھا۔ آپ ﷺ نے صرف عید الفطر اور عید الاضحیٰ ہی بتائیں اور منائیں۔ جو مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ دین اسلام میں تین عیدیں ہیں وہ نہیں جانتا کہ اس کے اس عقیدے کی زد کہاں تک پڑتی ہے۔ جہاں تک رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت یا آپؐ کی سیرت اور فضائل بیان کرنے کا تعلق ہے تو اس کے لیے سال کا کوئی ایک دن مقرر کرنے اور پھر پورا سال اس کے آنے کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ ﷺ کے ذکر خیر سے تو ہفتے کا کوئی دن بلکہ دن کا کوئی لمحہ خالی نہیں ہونا چاہیے۔

مختصر یہ کہ جو لوگ یہ تیسری عید منا رہے ہیں وہ اپنی مرضی سے منا رہے ہیں' اور جو اسے نہیں منا رہے وہ سنتِ رسولؐ اور سنت صحابہؓ کے طریقے پر ہیں' کیونکہ اس طریقے میں یہ موجود نہیں۔ آج بڑے سے بڑا مسلمان عالم دین بھی آپ ﷺ کی امت پر کوئی غیر مسنون کام لازم قرار نہیں دے سکتا۔ اُمت کے لیے آپ ﷺ ہی مطاع ہیں۔ اگر آج سے دو تین صدیاں پہلے کے مسلمانوں سے پوچھا جاتا کہ اسلام میں کتنی عیدیں ہیں تو ان کا ایک ہی جواب ہوتا کہ دو! کیونکہ یہ تیسری عید ان کے ہاں موجود ہی نہ تھی۔ یہ تو سینکڑوں سال بعد کی پیداوار ہے۔

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 45 روپے   اشاعت عام: 25 روپے

ذُوالقرنین، سدِّ ذُوالقرنین اور --- یاجوج ماجوج (۴)

شاہین عطر جنجوعہ

اب آیئے اس قصے کے دوسرے پہلو کی طرف جو قرآن پاک میں سورۃ الانبیاء میں مذکور ہے:

﴿وَحَرٰمٌ عَلٰی قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتْ
یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾﴾

’’اور مقرر ہو گیا ہر بستی پر کہ جس کو ہم نے کھپا دیا کہ وہ نہیں پھرے گی یہاں تک کہ جب کھول دیں یاجوج ماجوج اور وہ ہر اچان سے پھسلتے آویں۔‘‘

اس آیت میں ایک قاعدہ کلیہ دیا گیا ہے۔ قرآن کے نزول (620ء قریباً) کے وقت بتا دیا گیا کہ کوئی ہلاک شدہ قوم اس وقت تک پلٹ نہیں سکتی جب تک یاجوج ماجوج ہر بلندی سے پھسلنے نہیں لگتے۔

سورۃ الانبیاء میں اس آیت سے پہلے مشرقِ وسطیٰ کی تباہ شدہ قوموں کے حالات اور واقعات بیان ہوئے ہیں۔ اس پر ایک خیال آتا ہے کہ کیا یہ قومیں یا ان میں سے کوئی قوم پلٹ سکے گی؟ تو اس بارے میں یہ آیت بتا دیتی ہے کہ اُس وقت پلٹیں گے جب یاجوج ماجوج ہر بلندی سے گریں گے۔

جب قرآن نازل ہو رہا تھا اُس دور میں جو قومیں تباہ ہو چکی تھیں ان میں مشہور ترین یہود

☆ ’’بحث و نظر‘‘ کے عنوان سے شائع شدہ مضامین کے مندرجات سے ادارہ میثاق کا اتفاق ضروری نہیں۔ وضاحت طلب امور کے لیے صاحب مضمون سے رابطہ کیا جا سکتا ہے:

فون: 03345080530، ای میل: shaheenattar@yahoo.com

تھے۔ اُس کے علاوہ اس وقت عالمی منظر پر چھائی ہوئی دو سلطنتیں تھیں، مغرب میں روم اور مشرق میں ایران۔ مشرق میں مزید ہندوستان بھی ایک نمایاں سلطنت نہیں تو تہذیب ضرور تھی۔ اسی طرح چینی سلطنت بھی قائم تھی۔ لیکن سلطنت والا رعب داب اور کروفر صرف کسریٰ یا روم میں تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یاجوج ماجوج میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ ان کے ہر بلندی سے گرنے کے بعد قوم پلٹ آئے گی؟ اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں سمیری تہذیب اور یاجوج ماجوج کی نوعیت کو ذرا تفصیل سے سمجھنا پڑے گا جس کا پیچھے مختصر سا حال بیان ہوا ہے۔

Mesopotamia میں، یعنی دجلہ فرات کے جنوبی سنگم کے قریب، اولین زراعت اور آبادکاری کی ابتدا ہوئی۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں دریاؤں کا پانی آکر ملتا تھا تو اردگرد کا علاقہ بہت زرخیز تھا۔ بانس/نرکٹ کے درخت یہاں کثرت سے تھے، کیونکہ یہ دلدلی علاقہ تھا۔ بانس نرکٹ کو گھر بنانے کے لیے اور زمین کو فصل کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ گیلی مٹی سے اینٹیں بنانے کا عمل بھی ایجاد کر لیا گیا اور گھر اینٹوں کے بنائے جانے لگے۔ شمالی علاقہ زیادہ ہموار تھا اور بالائی بھی۔ وہاں دجلہ وفرات کا بہاؤ بہت غیر متوازن ہوتا، یعنی دریا کا اچانک رخ موڑ لینے کا یا سیلاب آ جانے کا خدشہ ہوتا تھا۔ اس لیے وہ علاقہ شروع میں آباد نہ ہو سکا۔

جنوبی علاقے میں زراعت کے ساتھ اور زراعتی رسوم اور طریقے بھی ایجاد کر لیے گئے۔ آب پاشی کے لیے نہریں کھودی گئیں۔ پانی روکنے اور ضرورت کے وقت کھولنے کے لیے پشتے بنائے گئے۔ نہروں کی کھدائی، صفائی اور فصل کٹائی جیسے ہزاروں کام شروع ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ خوراک ذخیرہ کرنے اور تقسیم کرنے کا نظام وضع ہوا۔ زمین کی تقسیم اور خرید و فروخت بھی شروع ہو گئی اور اس کو منصفانہ بنانے کے قواعد اور قوانین بھی وضع ہو گئے۔

خانہ بدوشی کی زندگی کی بہ نسبت زراعتی زندگی نے انسان کو یہ فائدہ دیا کہ کچھ افراد بہت سارے لوگوں کے لیے خوراک مہیا کر سکتے تھے اور یہ خوراک اگر حفاظت صحیح ہو تو ضائع ہو جانے کا خدشہ نہیں ہوتا۔ یہ کام 7500 ق م میں شروع ہوا۔ آبادی بڑھی تو شہر بڑھتا گیا اور نئے نئے شہر وجود میں آتے گئے۔ آج ان شہری ریاستوں کے نام سے اُس دور کی مختلف تہذیبوں کو یاد کیا جاتا ہے، کیونکہ ہر شہر ایک تہذیب بھی ہوتا، مثلاً سمیری، بابلی اور اشوری ریاست اور تہذیب وغیرہ۔ اسی طرح بابل شہر کے نام پر بابلونہ ایک تہذیب تھی۔ وہ ایک سلطنت بن گئی، کیونکہ بابل نے بہت سے دیگر شہروں کو اپنے ماتحت کر لیا۔ بابل کی تہذیب کے عناصر میں بہت سی باتیں پرانی تہذیبوں سے موروثی طور پر حاصل کی گئی تھیں، کیونکہ یہ نسبتاً دیر

سے وجود میں آنے والی سلطنت اور تہذیب تھی‘ لیکن اس کے مطالعے سے ہم Mesopotamia کی کسی تہذیب کے عمومی خصائص کو جان سکتے ہیں۔ ابتدائی بابلونہ (بابلونہ سے مراد شہر بابل نہیں ہے بلکہ تہذیب ہے) میں ترقی اور تاریخی عوامل پر فوقیت رکھنے والے اہم عناصر تین تھے:

(1) مذہب آبادی کا inspiring اور تنظیم کنندہ عنصر تھا۔ حکومت کے افسران مذہب کے نمائندے تھے۔ ہر شہر کے وسط میں ایک مندر ہوتا‘ جس میں اس شہر کا/ کی محافظ دیوتا/ دیوی اور بادشاہ رہائش پذیر ہوتے۔ اس بات کا علم کہ سیاسی میدان (قوت اور اقتدار) میں اضافہ ہو رہا ہے کہ نہیں‘ دیوتا کی وسعتِ عبادت (وسیع رقبہ جات پر محیط علاقہ) سے ملتا تھا۔ کسی شہر کے آقا اور شہری خدا کے خادم ہوتے۔ شہر کا دیوتا/ دیوی انصاف کا سرچشمہ اور اس کے پادری ثقافت کے کلید بردار/ ٹھیکہ دار ہوتے۔ تجارت‘ صنعت کی اجازت خداؤں کے وعدے میں مضمر تھی اور مندر‘ بینک‘ توشہ خانے (granary)‘ تجارتی سرگرمی اور تبادلے کا مرکز تھے۔ تمام زندگی کا مذہب پر مدار تھا اور ساری زندگی میں اس کا اثر ونفوذ تھا۔

(2) شہری ریاستوں کی طاقت اور توانائی کا مرکز حکمران تھا۔ وہ اعلیٰ ترین اور لامحدود اختیارات رکھتا تھا۔ خدا کا خادم اور خدائی اقتدار کا نمائندہ‘ جنرل‘ قاضی اور سب سے بڑا پادری (مذہبی خدمت گزار) تھا۔ لوگوں کے تمام معاملات اس کے لیے ایک اشتیاق‘ مناجات (solicitude) کی شے ہوتے۔ اس کا نام مندروں‘ محلات کے تعمیراتی پتھروں پر کندہ کیا جاتا۔

(3) ان دو محرکات‘ مذہب اور حکومت کے ملاپ سے تیسرا محرک ابھرتا۔ توسیع کا محرک‘ ناخدا‘ نا بادشاہ‘ مقامی حکومت سے مطمئن ہوتا۔ ایک (بادشاہ) کے ارادے دوسرے (معبود) کی خدائی توصیف‘ حوصلہ افزائی اور بااثر مدد کے ذریعے مقدس ہو جاتے اور اس سے تحریک حاصل ہوتی۔ خدا آفاقی تسلط کا دعوے دار ہوتا تھا‘ لہٰذا بادشاہ‘ اُس کے نمائندے کے طور پر‘ اُس کے حکم کے تحت بڑھ کر فتح کرتا۔ لوگ اپنے خدا اور انسانی آقا کی پیروی کرتے جہاں تک وہ لے جاتا۔

مندرجہ بالا محرکات کے تحت شروع ہونے والا توسیع اور الحاق (unification) کا سلسلہ دو ہزار سال کے عرصے پر محیط تھا‘ 4500 ق م سے 2250 قبل مسیح۔

پہلے دور میں جدوجہد بابلونہ کے شہروں کے اندر تھی‘ مقامی بالادستی کے لیے۔ شہروں کے

اندر بالادست طبقات کے ظہور میں کچھ قدرتی عوامل اور کچھ انسانی خود غرضی‘ لالچ اور ہتھکنڈوں کے عوامل کارفرما تھے۔ شہروں کے اندر طبقاتی تقسیم کچھ اس طرح نمودار ہوئی۔ زمین خوراک کا ذریعہ تھی۔ خوراک کا حصول زمین کی زرخیزی اور وافر دریائی پانی کی فراہمی پر منحصر تھا۔ شہری زندگی کی ابتدا میں تو کوئی انسانی باہمی کشمکش اور چھینا جھپٹی نظر نہیں آتی۔ لیکن آہستہ آہستہ زمین کے ارتکاز سے جاگیردار طبقات وجود میں آئے۔ ہوتا کچھ یوں کہ جن لوگوں کی زمین دریا یا نہر سے دور ہوتی ان کی فصلوں کو کم پانی ملتا جس سے فصل کم اُگتی۔ بعض دفعہ ان لوگوں کی فصل بھی جن کی دریا سے قریب زمینیں ہوتیں‘ کسی حادثے کی وجہ سے‘ کم ہوتی۔ ایسے ناگزیر حادثات میں ہمسایوں اور مخیّر حضرات سے اناج لے لیا جاتا۔ لیکن مستقل فصل کی گراوٹ اور قرض گیری کے نتیجے میں قرض دہندہ‘ مقروض کی زمین گھر اور دیگر املاک قبضہ کر لیتا۔ اس کے لیے قانونی اجازت تھی اور اس قبضے کو قانونی توثیق اور تحفظ حاصل ہوتا تھا۔ اب بے خانماں شخص کے لیے دو راستے ہوتے‘ یا تو وہ اس علاقے کو چھوڑ دے‘ یا وہیں اپنے پرانے ہم پلہ کسانوں کا غلام بن جائے۔ لہٰذا وہ صرف ’’خوراک‘‘ بطور مزدوری کی قیمت پر پرانے رفقاء کار کا غلام بن جاتا۔ یوں زمینوں کے ارتکاز سے 'matgog' (ماجوج) ’’جاگیردار‘‘ وجود میں آیا اور دوسری طرف کاشت کار (جوج) gog۔

کچھ ہی عرصے بعد میسوپوٹیمیا میں ایک اور ایجاد ہوئی‘ یعنی ’’کرنسی‘‘۔ پرانے طریقے میں تبادلہ اشیاء کا طریقہ barter تھا‘ شے کے بدلے شے۔ اناج‘ بھیڑ‘ بکری یا کوئی اور ضرورت کی شے لینے دینے کے لیے ایک شے دو اور دوسری شے لے لو۔ لیکن چاندی (silver) بطور کرنسی سب سے پہلے میسوپوٹیمیا میں ایجاد ہوئی۔ یہ دھات میسوپوٹیمیا میں کمیاب تھی‘ لہٰذا کرنسی کا درجہ حاصل کر گئی۔ اس کرنسی کی سب سے چھوٹی اکائی (unit)'shekel' تھی۔ اس کے بعد شے خریدنے کے لیے 'shekel' کی ضرورت ہوتی اور بیچ کر 'shekel' ملتے۔ اناج بطور کرنسی کے بجائے shekel بطور کرنسی کے بہت سے فائدے تھے۔ ڈھیر سارے اناج کو سنبھالنے کے بجائے چند چاندی کے ٹکڑے سنبھالنا آسان تھا۔ ثانیاً‘ باقی سب اشیاء ضائع بھی ہو سکتی تھیں‘ مثلاً اناج کو چوہے کھا سکتے تھے‘ دیمک لگ سکتی تھی‘ بھیڑ یا بکری مر بھی سکتی تھی‘ لیکن چاندی کا shekel ضائع نہیں ہو سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ چاندی کے ’’ٹکڑوں‘‘ کا مالک ہو جانا بہت بڑا ’’جاگیردار‘‘ ہونے کے مترادف ٹھہرا۔

ایک اور شے بابلونہ میں ''سود'' کی ایجاد ہے۔ اناج کے بدلے اتنے ہی اناج کے بجائے اناج پر سود کے طور پر مزید اناج لیا جانے لگا۔ یہ سود 33 فیصد تک کا بھی تحقیق سے معلوم ہوا ہے۔ اور بعض اوقات سود اتنا بڑھ جاتا کہ بادشاہ کی طرف سے باقاعدہ فرمان جاری ہوتا جو قرض اور سود یا صرف سود کو منسوخ کر دیتا۔ ایسے بہت سے شاہی فرمان آثارِ قدیمہ میں دریافت ہوئے ہیں جو مختلف بادشاہوں نے جاری کیے' سود معاف کرنے کے لیے۔

اس طرح میسوپوٹیمیا میں ایک اعلیٰ طبقہ ''Aulim'' اور دوسرا ادنیٰ طبقہ ''Muskinim'' وجود میں آیا۔ زمین کی ذاتی ملکیت' بہت سی خوراک' بہت سی چاندی یہ ایسے تہذیبی فوائد تھے کہ Meso کی تہذیب میں ہر شخص کے لیے ایک incentive موجود تھا۔ چنانچہ آگے بڑھنے کی خواہش پیدا ہوتی۔ ڈھیر سا اناج' ڈھیر سی چاندی جمع کرنے سے زندگی پرسکون اور محفوظ ہو جاتی۔ اس کے ساتھ ساتھ بادشاہت اور بادشاہوں کی نمود و نمائش بھی دلچسپی کی شے تھی۔ ان کی دیکھا دیکھی اشرافیہ بھی نمود و نمائش اور پُرشکوہ اور پرآسائش زندگی کی عادی ہوگئی۔ یہ سب مراسم و رواجات' زمین' دولت اور وسائل کے ارتکاز کی ہوس پیدا کر دیتے۔

بابلونیہ میں ترقی اور تاریخی عوامل کے مندرجہ بالا اسباب کے تحت' یعنی مذہب' اقدار و حکومت اور اشرافیہ کی دولت کی طلب کے تحت شہروں کی اندرونی جدوجہد کے بعد ایک نئی جِدّوجُہد شروع ہوئی۔ (جاری ہے)

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ
کے دو فکر انگیز خطابات پر مشتمل کتابچہ

توبہ کی عظمت اور تاثیر

اور موجودہ حالات میں کرنے کا اصل کام

اشاعتِ خاص: 65 روپے　اشاعتِ عام: 35 روپے

Dec. 2014
Regd. CPL No. 115
vol. 63
No.12

Monthly **Meesaq** Lahore

قرآن حکیم کی عظمت، تعارف اور حقوق و مطالبات
جیسے علمی و عملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

قرآن حکیم اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمدؒ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ تقریباً 500 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

خود پڑھیے ـ دوسروں کو تحفہ میں دیجیے!

اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-042-35869501
maktaba@tanzeem.org